مسلمان
سپہ سالار اور فاتح
حصہ دوم
سید محمد نصیر جامی
احسن برادرز چوک انارکلی لاہور
DATA ENTERED

اشاعتِ اوّل

تعدادِ اشاعت	۱۰۰۰
قیمت	دو روپے
مارچ	۱۹۵۳ء

شیخ محمد نصیر ہمایوں پرنٹر پبلشر نے اتحاد پریس ہل روڈ لاہور میں
چھپوا کر احسن برادرز چوک انار کلی لاہور سے شائع کیا۔

فہرست

دیباچہ

اس کتاب کا مقصد پہلے حصہ کے شروع میں بیان ہو چکا ہے۔ جیسا کہ آپ نے پڑھا ہو گا اس حصہ میں آٹھ سپہ سالاروں اور فاتحوں کے حالات درج کیے گئے ہیں دوسرے حصہ میں نو کا تذکرہ ہے۔ مسلمانوں میں بے شمار جانباز اور بہادر گزرے ہیں جن کے نام اگرچہ اس قدر مشہور نہیں ہیں مگر جن کے کارنامے نظر انداز نہیں کیے جا سکتے۔ انہوں نے دُنیا کو جہاد فی سبیل اللہ کے ایسے ایسے مناظر دکھائے جن کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ارادہ ہے کہ ان کے سوانح حیات بھی کسی وقت قلم بند کرائے جائیں۔ اسلام ایک زندہ قوت ہے اور اس نے مسلمانوں میں جہاد کا ایک ایسا ولولہ پیدا کر دیا ہے جو کسی وقت فنا نہیں ہو سکتا۔ ممکن ہے ابھی ہماری قوم میں ایسے نوجوان موجود ہوں جو کسی وقت کوئی ایسا کارنامہ کر دکھائیں کہ ان کا نام بھی تاریخ کے اوراق میں سنہری حرفوں میں لکھا جائے۔

ہم نے اس امر کی پوری کوشش کی ہے کہ کتاب کی زبان سادہ اور پیرایۂ بیان دلچسپ ہو۔ حالات اگرچہ مختصر طور سے بیان کئے گئے ہیں مگر کوئی ضروری بات نہیں چھوڑی گئی۔ ہم پھر اس امید کا اعادہ کرتے ہیں جو پہلے حصہ میں کر آئے کہ ہمیں چاہئے کہ ہم بھی اپنے دلوں میں بہادری اور جرأت پیدا کریں اور ان بزرگوں کے نقشِ قدم پر چلنے کی سعی کریں۔

سیّد نصیر احمد

یوسف بن تاشفین
(افریقی مجاہد)

یوسف بن تاشفین

آپ پہلے پڑھ چکے ہیں کہ طارق بن زیاد اور موسیٰ بن نصیر نے اندلس فتح کیا تھا۔ اس فتح کے بعد مسلمان ایک عرصہ تک وہاں بڑی شان و شوکت سے حکومت کرتے رہے۔ اُنھوں نے وہاں بڑی شاندار عمارتیں بنوائیں، نئے نئے شہر بسائے، خوب صورت باغ لگوائے، سکول اور کالج قائم کئے۔ غرض ملک کی بہتری کے لئے جو کچھ ہو سکتا تھا، کیا۔ وہاں مسلمانوں نے علم و ہنر میں اتنی شہرت حاصل کی کہ نہ صرف اسلامی بلکہ یورپ کے ملکوں سے بھی طلبا وہاں پڑھنے آتے تھے۔ یورپ نے وہاں سے بہت کچھ حاصل کیا، اور بعد میں اُنھوں نے جو ترقی کی، وہ اندلس کے مسلمانوں کے طفیل ہی کی۔

لیکن ایک عرصہ کے بعد ایسی صُورتِ حالات پیدا ہو گئی کہ مسلمانوں

میں اتفاق نہ رہا۔ وہ آپس میں لڑتے بھڑتے رہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اندلس میں کئی حکومتیں قائم ہوگئیں۔ اگر ان حکومتوں کے بادشاہ اپنی رعایا کو اپنے ملک کی بھلائی میں لگے رہتے، تو کوئی بڑی بات نہ تھی۔ مگر وہ ایک دوسرے سے لڑتے جھگڑتے رہتے تھے۔ اس وقت یہاں مسلمانوں کی جو ریاستیں قائم ہوگئی تھیں، ان میں غرناطہ، طلیطلہ، اشبیلیہ اور المیریا کو بہت اہمیت حاصل تھی۔ مگر جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، ان میں نام کو بھی اتفاق نہ تھا، بلکہ ان کے حکمراں ایک دوسرے کو برباد کرنے پر تُلے ہوئے تھے۔ ان کا سب سے بڑا دشمن قسطلہ کا عیسائی بادشاہ الفانسو ششم تھا۔ یہ نہایت چالاک اور عیار بادشاہ تھا، اور اس نے مسلمانوں کی نااتفاقیوں اور خانہ جنگیوں سے فائدہ اُٹھا کر بڑی قوت حاصل کر لی تھی۔ یہاں تک کہ کئی مسلمان ریاستوں سے خراج تک وصول کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ اُس نے اتنی قوت حاصل کر لی کہ مسلمانوں کے کئی علاقے چھین لئے۔ مسلمان یہاں کہیں بھی آباد تھے قتل ہوتے جا رہے تھے۔ مسلمان بادشاہوں کو اتنی توفیق نہ تھی، کہ مل کر دشمن کا مقابلہ کرتے۔ اگرچہ چند روز تک یہی حالت اور رہتی تو اندلس کے مسلمان یقیناً تباہ ہو جاتے۔ مگر ابھی قدرت کو کچھ دِنوں اور مسلمانوں کی لاج رکھنا منظور تھی۔ عین موقعہ پہ ایک شخص ان کی مدد کو آیا اور دشمن کے ارادے ناکام کر دیئے۔ یہ شخص افریقہ کا بادشاہ

یوسف بن تاشفین تھا۔ اس بادشاہ میں بڑی خوبیاں تھیں۔ وہ بڑا پرہیز گار اور نیک تھا، اور ساتھ ہی بہت بڑا سیاستدان بہادر اور جری بھی تھا۔

جب اندلس کے مسلمانوں نے دیکھا، کہ وہ چاروں طرف سے ایک خوفناک مصیبت میں گھرے ہوئے ہیں تو انہوں نے سوچا کہ یوسف بن تاشفین سے مدد کی درخواست کرنی چاہیئے۔ اشبیلیہ کے بادشاہ معتمد کو بھی اس کا احساس ہوا۔ اس لئے کہ الفانسو اس کے ملک پر حملہ کرنے کی بڑے زور شور سے تیاری کر رہا تھا۔ آخر اندلس کے مسلمانوں کا ایک وفد یوسف بن تاشفین کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس وفد میں اندلس کے شہروں کے بڑے بڑے عالم، فقیہہ اور سیاست دان شامل تھے۔ انہوں نے افریقہ کے بادشاہ کے سامنے نہایت واضح طور سے اندلس کے مسلمانوں کی پریشانیوں اور تکلیفوں کی تصویر کھینچ کر رکھ دی۔ یوسف بن تاشفین نے یہ روئداد سُنی، تو اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس نے تلوار پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی کہ وہ اپنے مسلمان بھائیوں کا بدلہ دشمن سے ضرور لے گا۔ وفد کے لوگ خوشی خوشی اندلس واپس آ گئے۔

بادشاہ یوسف نے تلوار پر ہاتھ رکھ کر جو قسم کھائی تھی اسے پورا کیا۔ سب سے پہلے اس نے جہاد کی عام منادی کرائی، اور دیکھتے دیکھتے ملک کے چاروں طرف سے کئی سو مجاہد پایۂ تخت میں جمع ہو گئے۔ اس کے پاس سرف

سو جہاز تھے۔ ان جہازوں میں جتنی فوج بھیجی جا سکتی تھی وہ جزیرۃ الخضرا میں بھیج دی گئی۔ جب یہ خالی جہاز واپس آئے، تو دوسری بار پانچ ہزار فوج وہاں پہنچ گئی۔ اس طرح فوج کی کل تعداد سترہ ہزار تھی۔ جب یوسف جزیرۃ الخضرا سے اشبیلیہ کی طرف روانہ ہوا، تو ہر جگہ بڑی شان سے اس کی آؤ بھگت ہوئی۔ اشبیلیہ کے دروازہ پر معتمد نے اس کا عظیم الشان استقبال کیا۔ یوسف شہر سے باہر ہی ٹھہرا کیونکہ اسے خوب علم تھا کہ شہر میں ٹھہرنے سے بہت سی غلط فہمیاں پیدا ہوں گی۔ لوگ یہ سمجھیں گے کہ افریقہ کا بادشاہ ان کے شہر پر قبضہ کر بیٹھا ہے۔ مصلحت یہی تھی، کہ وہ باہر ہی ٹھہرے اور اپنا کام ختم کر کے وطن لوٹ جائے۔ معتمد نے بادشاہ کے اعزاز میں ایک بہت بڑی دعوت دی اور اس کے سپاہیوں کو بہت سے تحفے تحائف دیئے۔ جب ساری فوجیں اکٹھی ہو گئیں، تو ان کی تعداد بیس ہزار سے زیادہ نہ تھی۔ اس فوج کو لے کر یوسف آگے بڑھا۔

جب الفانسو کو یہ اطلاع ملی، تو وہ سرقسطہ کے محاصرہ میں مشغول تھا اس نے محاصرہ کو چھوڑا اور اپنی ریاست کے تمام سرداروں کو حکم دیا کہ وہ اپنی اپنی فوج لے کر طلیطلہ میں پہنچ جائیں۔ طلیطلہ میں جب عیسائی فوجیں جمع ہوئیں، تو اُن کی کُل تعداد ساٹھ ہزار تھی۔ ان میں کئی ہزار فرانسیسی بھی تھے۔ الفانسو زلاقہ کی طرف بڑھا جہاں یوسف بن تاشفین بھی پہنچ گیا تھا

زلاقہ کے میدان میں دونوں فوجیں ایک دوسرے کے مقابل آئیں
سب سے پہلے یوسف بن تاشفین نے الفانسو کو پیغام بھیجا کہ وہ مسلمان ہو
جائے یا جزیہ دینا منظور کرلے۔ الفانسو نے جواب دیا کہ اندلس کے تمام
بادشاہ مجھ کو خراج دیتے ہیں۔ میں تمہاری کسی بات کو قبول نہیں کرتا میرے
پاس ایسی زبردست فوج ہے، جو تمہیں تباہ کردے گی۔ جب یوسف کے
پاس یہ جواب پہنچا تو اُس نے اس کے نیچے صرف ایک سطر لکھی، کہ جو کچھ
ہونے والا ہے اُسے تم خود دیکھ سکو گے۔

اب فریقین کی فوجیں اس قدر قریب تھیں کہ ایک دوسرے کو دیکھ
سکتی تھیں۔ مسلمان فوجوں میں اندلسی فوج آگے تھی، اور یوسف کی فوج
پیچھے پہاڑیوں میں رکھی گئی تھی۔ اس زمانے کی رسم کے مطابق سوموار کا دن
جنگ شروع ہونے کے لئے مقرر کیا گیا۔ یوسف نے اس پر کسی قسم کا شک
نہ کیا۔ لیکن معتمد، الفانسو سے خوب واقف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ عیسائی
بادشاہ بڑا بے وفا اور بد دیانت ہے۔ وہ ضرور دھوکا دے گا، اور مقررہ دن
سے پہلے ہی جنگ شروع کردے گا۔ لہٰذا معتمد نے بڑی احتیاط سے
کام لیا۔ دوہرے دوہرے پہرے لگا دیئے، اور پہرہ داروں کو حکم دیا کہ
اگر دشمن کی فوج ذرا سی بھی حرکت کرے، تو اس کی فوراً اطلاع دیں۔ سپاہیوں
کو حکم تھا کہ وہ ہتھیار لگا کر سوئیں۔ یہ احتیاطیں کچھ بے وجہ نہ تھیں۔ اس

جنگ پر ان کے مستقبل کا انحصار تھا۔ دشمن کو ان پر بڑی فوقیت حاصل تھی
عیسائیوں کی تعداد ساٹھ ہزار تھی، اور مسلمانوں کی کل بیس ہزار یعنی تین
عیسائیوں کے مقابلہ میں ایک مسلمان۔ عیسائیوں کے گھوڑے بھی مسلمانوں
سے زیادہ قوی تھے، اور ان کے ہتھیار زیادہ اچھے اور بوجھل تھے۔ پھر
عیسائی پادری اپنے پُرجوش وعظوں سے سپاہیوں کے دل بڑھاتے
رہتے تھے۔ اُنھوں نے اس جنگ کو صلیبی جنگ کی سی اہمیت دے
رکھی تھی۔ دُوسری طرف معتمد بڑا بے چین تھا۔ لیکن یوسف بن تاشفین کو
کامیابی پر پورا بھروسہ تھا۔ آخر وہی ہُوا جس کا خدشہ تھا۔ مقررہ دن
سے پہلے ہی عیسائیوں نے مسلمانوں پر حملہ کر دیا، اور پہلے ہی حملہ میں عیسائی
دُور تک آگے بڑھ گئے۔ اس کے باوجود یوسف کی فوج نے ذرا بھی حرکت
نہیں کی۔ اس نے ایک ایسی جنگی تدبیر سوچی تھی، جس کے کامیاب ہونے
کا اسے پُورا یقین تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد امیر یوسف نے اپنی فوج کو حرکت
کا حکم دیا۔ اور الفانسو کی فوج پر پیچھے کی طرف سے ہلّہ بول دیا۔ یہ حملہ
بڑے زوروں کا تھا۔ الفانسو کے سپاہی اس کی تاب نہ لاسکے۔ آن
کی آن میں ہزاروں کے ٹکڑے اُڑ گئے۔ خیموں میں آگ لگ گئی۔ عیسائیوں
نے جب یہ دیکھا کہ ان کا تمام سامان جل گیا ہے، اور جو کچھ بچا تھا، اسے
لُوٹ لیا گیا ہے، تو ان میں بڑی بددلی پھیل گئی۔ شام ہونے تک عیسائی

کے پاؤں اکھڑ گئے۔ اور وہ میدان سے بھاگ اُٹھے۔ بیس ہزار سے زیادہ وہیں مارے گئے۔ ان کی قسمت اچھی تھی، کہ رات ہو گئی، ورنہ شاید ایک سپاہی بھی زندہ نہ بچتا۔ خود الفانسو بری طرح زخمی ہوا تھا۔ مگر وہ کسی نہ کسی طرح سے بچ نکلا۔ دُوسرے دن صبح کو جب یوسف نے میدانِ جنگ کو دیکھا، تو ہر طرف عیسائیوں کی لاشوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ اور مالِ غنیمت جگہ جگہ بکھرا پڑا تھا۔ امیر یوسف نے سارا مالِ غنیمت معتمد اور اس کے ساتھیوں کے حوالے کر دیا۔

یہ بہت بڑی فتح تھی، جو ایک عرصہ کے بعد اندلس میں مسلمانوں کو عیسائیوں پر حاصل ہوئی۔ اس فتح سے عیسائیوں کی طاقت کو بے حد نقصان پہنچا۔ امیر یوسف آگے بڑھنے کا ارادہ کر ہی رہا تھا کہ اسے اپنے جوان بیٹے کی موت کی خبر ملی۔ اُسے اپنے اِس بیٹے سے بڑی محبت تھی۔ اُس نے آگے بڑھنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ اور تین ہزار سپاہی معتمد کے پاس چھوڑ کر اپنے ملک واپس لوٹ گیا۔

اِس فتح کا تھوڑے عرصہ تک تو کافی اثر رہا۔ مگر اس کے بعد عیسائیوں نے پھر ہاتھ پیر نکالنے شروع کر دیئے۔ انہوں نے حصن اللّیط کو اپنا مرکز بنایا۔ یہاں سے وہ اِرد گرد کے علاقوں پر حملہ کرتے، بستیوں کو لوٹتے، اور جلا دیتے، اور مردوں کو بے دریغ قتل کر ڈالتے۔ مسلمان بادشاہ یہ سب

کچھ دیکھتے اور ٹس سے مس نہ ہوتے۔ انہیں عیش و عشرت اور رنگ رلیوں سے فرصت ہی کب تھی۔ اندلس کے لوگوں نے ایک بار پھر امیر یوسف بن تاشفین کی خدمت میں ایک وفد بھیجا اور اس سے مدد کی درخواست کی۔ اسے اندلس کے لوگوں سے پوری ہمدردی تھی، ان کی پریشانی اس کی اپنی پریشانی اور ان کی تکلیف اس کی اپنی تکلیف تھی۔ مگر وہ اندلس کے بادشاہوں کی مرضی کے بغیر وہاں جانا نہ چاہتا تھا۔ اس نے وفد سے کہا کہ میں تمہاری مدد کرنے کو تیار ہوں، مگر اپنے بادشاہوں سے کہو کہ وہ مجھے بلائیں۔ وفد کے اراکین نے اس کی اطلاع بادشاہوں کو پہنچائی۔ چنانچہ معتمد خود افریقہ گیا، اور امیر یوسف سے امداد کی التجا کی۔ ایک بار پھر یوسف اندلس پہنچا۔ اشبیلیہ کے باہر پھر اس کا استقبال ہوا۔ وہیں تمام بادشاہوں کی فوجیں اس کے پاس آگئیں اور وہ انہیں ساتھ لے کر حصن اللّیط کی طرف بڑھا جہاں عیسائی اُس کے آنے کی خبر سُن کر قلعہ بند ہو گئے تھے۔ امیر یوسف نے وہاں کا محاصرہ کر لیا۔ وہاں کی دیواریں بڑی مضبوط تھیں۔ چار ماہ محاصرہ رہا مگر ذرا بھی کامیابی نہ ہوئی۔ امیر یوسف کو دن رات اس کی فکر تھی کہ یہ قلعہ کیسے سر کیا جائے۔ مگر دُوسری طرف جو بادشاہ آئے تھے، اُن کی عجیب حالت تھی۔ وہ بدستور رنگ رلیاں منا رہے تھے۔ ان کی محفلوں میں دن رات یا تو مغنی اپنے کمال کا مظاہرہ کرتے یا شاعر اپنے

اشعار سے ان کا دل خوش کرتے تھے۔ شراب نوشی کی لعنت عام تھی۔ اندلس کے لوگ جب یہ دیکھتے کہ ان کے بادشاہ ہر قسم کے عیب میں مبتلا ہیں۔ اور افریقہ کا بادشاہ کتنا پرہیز گار کتنا نیک اور کتنا بہادر ہے، تو ان کی عجیب حالت ہو جاتی۔ آخر ایک دن انہوں نے امیر یوسف سے درخواست کی، کہ وہ اندلس ہی میں رہ جائے۔ یہاں کا بادشاہ بن جائے۔ اس میں اندلس کی بھلائی ہے۔ امیر یوسف نے یہ سنا، تو اس کے دل میں ایک عجیب کشمکش پیدا ہو گئی۔ وہ سوچنے لگا کہ کیا مسلمانوں کے بقا کی صورت اس کے سوا اور کوئی نہیں ہے؟ انہی دنوں غرناطہ کا قاضی ابوجعفر اس کے پاس آیا اور اسے بتایا کہ غرناطہ کا بادشاہ کتنا ظالم اور عیاش ہے۔ عوام اس کے خلاف ہیں، اس لئے وہ عوام کی مدد کرے۔

امیر یوسف اندلس کے بادشاہوں کے طرزِ عمل سے سخت بددل ہو گیا تھا۔ اس نے مناسب نہیں سمجھا کہ ایسے لوگوں کے ساتھ مل کر رہے۔ وہ اپنی فوج لے کر الگ ہو گیا، اس وقت تک حصن اللیط کی فصیل دیواریں آدھی سے زیادہ ٹوٹ چکی تھیں، اور بارہ ہزار سپاہیوں میں سے گیارہ ہزار نو سو سپاہی بھوک سے مر چکے تھے، اور یوں محاصرہ کا مقصد پورا ہو چکا تھا۔ اسی اثنا میں خبر آئی کہ الفانسو حصن اللیط کی طرف بڑھ رہا ہے۔ جونہی معتمد اور اس کے ساتھیوں نے یہ خبر سنی وہاں سے بھاگ

گئے۔ جب الفانسو نے حصن اللّیط کی یہ حالت دیکھی تو اسے بے حد افسوس ہوا، اور اُلٹے قدم واپس ہوا۔ وہ جس راہ سے آیا تھا امیر یوسف اس انتظار میں تھا۔ الفانسو نے جب یہ سنا تو اس نے اپنا راستہ بدل دیا اور اس طرح امیر یوسف کے ہاتھوں بچ نکلا۔

جیسا کہ اُوپر بتا آئے ہیں۔ غرناطہ کے قاضی نے امیر یوسف سے درخواست کی تھی کہ وہ وہاں کے مسلمانوں کی اُن کے بادشاہ کے خلاف مدد کرے۔ امیر یوسف نے یہ درخواست منظور کر لی، اور غرناطہ جا کر وہاں کے بادشاہ کو تخت سے علیحدہ کر دیا۔ اور پھر عوام کے اصرار سے غرناطہ کی بادشاہت خود قبول کر لی۔

اس کے تھوڑے عرصہ بعد امیر یوسف کے پاس اندلس کے مسلمانوں کا ایک محضر پہنچا، جس میں لکھا تھا کہ اندلس کے بادشاہ عیش و عشرت میں غرق ہیں، اور خلافِ شریعت کام کرتے رہتے ہیں۔ لہٰذا امیر یوسف خود اندلس کی بادشاہت سنبھال لے۔ اس میں اندلس اور اس کے باشندوں کی بہتری ہے۔ جب یہ محضر امیر یوسف کو ملا تو اُس نے اسے افریقہ کے عالموں اور فقیہوں کے پاس بھیج دیا اور ان سے فتویٰ لیا کہ آیا شریعت کی رُو سے ایسا کیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ جب سارے عالموں اور فقیہوں نے فتویٰ دیا کہ ایسا ہو سکتا ہے، تو یوسف نے اندلس میں اپنی فوجوں کو

نام حکم جاری کر دیا کہ اندلس کے تمام بادشاہوں کے علاقوں کو اُن سے چھین لیا جائے۔ تھوڑی مدت میں المرسیہ، طریف اور قرطبہ پر قبضہ ہو گیا پھر اشبیلیہ کی باری آئی۔ اس کا محاصرہ کر لیا گیا۔ الفانسو نے ایک بڑی فوج معتمد کی مدد کے لئے بھیجی۔ لیکن امیر یوسف کی فوج نے اُسے بُری طرح شکست دی اور اس کے تھوڑے دنوں بعد اشبیلیہ بھی فتح ہو گیا۔ اس طرح آہستہ آہستہ سارے اسلامی علاقے امیر یوسف کے قبضہ میں آ گئے۔

ایک عرصہ کے بعد اندلس میں پھر خوش حالی اور فارغ البالی کا دور آیا۔ زندگی کے ہر شعبہ میں ترقی ہونے لگی۔ ظلم اور تشدد کا نام مٹ گیا۔ عدل و انصاف کی حکومت قائم ہو گئی۔ ہر فیصلہ قرآن اور سنت رسول کی روشنی میں ہونے لگا۔ کوئی بات شریعت کے مخالف نہ ہوتی۔ امیر یوسف نے فوجی مسائل کے علاوہ باقی سارے کام علماء کے سپرد کر دیئے تھے۔ بادشاہ اور اس کے امیروں کا اثر عوام پر ضرور پڑتا ہے۔ اپنے بادشاہ کو دیکھ کر عوام بھی نیک اور پارسا بن گئے اور ہر قسم کی بُرائیاں ختم ہو گئیں۔

امیر یوسف بن تاشفین کی سلطنت کا رقبہ اب اتنا ہو گیا تھا جتنا کہ بنی امیہ اور بنو عباس دونوں کی سلطنتوں کا مل کر ہوتا ہے۔ تمام شمالی افریقہ میں ٹیونس سے لے کر بحر اٹلانٹک تک اس کا سکہ چلتا تھا۔ ہر جمعہ کو کم از کم تین لاکھ مسجدوں کے منبروں پر اس کے نام کا خطبہ پڑھا جاتا تھا، اور نہ معلوم کتنے

کروڑ مسلمان اس کی بقائے دولت کے لئے دعائیں مانگتے تھے۔ ہر ایک بادشاہ اس کو اپنا شہنشاہ تسلیم کرتے تھے۔ رعایا کو اتنا آرام پہلے کبھی نہ پہنچا تھا۔ اتنی ارزانی انہوں نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ روٹی کی قیمت برائے نام رہ گئی تھی۔ مٹھی بھر ترکاری اور میوے چند کوڑیوں میں مل جاتے تھے۔ رعایا کے بیش تر حصے پر محصول بالکل معاف تھا۔ امیر یوسف نے عمر بھی بڑی لمبی پائی۔ وہ ایک سو سال زندہ رہا۔ اس کی تمام عمر کام کرتے ہی گزری۔ مسلمانوں کی بھلائی اور بہتری کے لئے اس نے ہر ممکن کوشش کی۔ وہ ان عیبوں میں نہیں پڑا، جو انسان کے جسم کو کھوکھلا اور دل کو کمزور کر دیتے ہیں۔ اس نے اپنی زندگی میں کسی مجرم کی سزائے موت کے حکم پر دستخط نہیں کئے، اور کبھی کوئی کام ایسا نہیں، جس سے اس کے نام پر دھبہ لگا ہو۔

سلطان صلاح الدین

(فاتح بیت المقدس)

سلطان صلاح الدّین

"خدا کی راہ میں لڑنا اس کا ایک نبلی جذبہ تھا۔
اس کا دل ہمیشہ اسی میں لپٹا رہتا، اور اسی میں
جان و تن کھپا دیا۔ اور تین آخری برسوں میں تو
سوائے جہاد کے کوئی اور خیال دل میں گزرتا ہی
نہ تھا۔ سوائے اس مضمون کے اور کسی مضمون پہ
بات نہ کرتا۔ ہر عیش و آرام اور بال بچوں میں
رہنے کی خوشی کو اس خدمت پر قربان کر رکھا تھا
ایک دن اپنے دوست سے پوچھنے لگا کہ موتوں
میں سب سے شاندار موت کون سی ہے؟ دوست
نے جواب دیا کہ خدا کی راہ میں جان دینا سب سے

بہتر موت ہے۔ کہنے لگا۔ اسی شاندار موت کے
دروازے کی طرف میں جا رہا ہوں"

آپ جانتے ہیں خدا کی راہ میں جہاد کا یہ شوقین اور اس شاندار موت کا یہ خواہش مند کون تھا۔ یہ سرفروش اسلام کا نامور مجاہد سلطان صلاح الدین ایوبی تھا۔ ایسا مجاہد جس کو نہ صرف مسلمان محبت سے یاد کرتے ہیں بلکہ اس کے دشمن بھی اس کا نام عزت اور ادب سے لیتے ہیں۔

صلاح الدین کردوں کے ایک بہت بڑے قبیلہ سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے دادا کا نام شادی تھا۔ شادی کے دو بیٹے تھے۔ ایوب نجم الدین اور شیر کوہ۔ وہ زمانہ قسمت آزمائی کا تھا۔ چنانچہ شادی اپنے دونوں بیٹوں کو لے کر وطن سے نکلا اور بغداد پہنچا۔ وہاں سے کچھ عرصہ کے بعد تکریت میں جا بسا۔ تکریت اس وقت کافی اہم قلعہ تھا۔ شادی کے انتقال کے بعد نجم الدین اور شیر کوہ تکریت سے چل کر موصل کے حاکم عماد الدین زنگی کے پاس پہنچے۔ اس زمانے میں مسلمانوں کی کئی چھوٹی چھوٹی ریاستیں قائم ہو چکی تھیں۔ ان میں سے موصل کی ریاست کافی بڑی تھی، اور یہاں کا حاکم بڑا نیک اور بہادر تھا۔ اس نے قلعہ بعلبک کی حفاظت کا انتظام نجم الدین کے سپرد کر دیا۔ عماد الدین کے قتل کے بعد نجم الدین نے دمشق کے سلطان کی ملازمت قبول کر لی، اور اس کا بھائی شیر کوہ عماد الدین کے بیٹے نور الدین کی خدمت

میں جا پہنچا۔ جو اس وقت حلب کا والی تھا۔

سلطان صلاح الدّین کی پیدائش اُس رات ہوئی، جب اُس کا باپ نجم الدین تکریت سے نکل کر عماد الدین زنگی کے پاس جا رہا تھا۔ سلطان نورالدّین زنگی نے جب دمشق فتح کیا، تو نجم الدّین نے بھی اس کی ملازمت اختیار کر لی۔ صلاح الدین کی عمر اس وقت سولہ برس کی تھی۔ باپ اور چچا دونوں کے ساتھ اس نے بھی سُلطان نورالدین کی خدمت میں جانا شروع کر دیا۔ نُورالدین نے اُسے دیکھتے ہی اندازہ لگا لیا کہ یہ نوجوان ذہین اور مجدا ہے۔ وہ اپنے عام درباریوں سے صلاح الدین کی زیادہ عزت کرتا۔ صلاح الدین نے بھی دیکھ لیا، کہ اُس کے آقا میں کس قدر خوبیاں ہیں۔ وہ شریف ہے، عالی حوصلہ ہے، نیک، ہمدرد اور بڑا دلیر اور بہادر ہے۔ اُس نے بھی کوشش کی کہ ان خوبیوں کو اپنے اندر جذب کرلے۔ ہمیں صلاح الدین کے بچپن کے حالات کچھ زیادہ معلوم نہیں۔ صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ اُسے دینیات، حدیث اور فقہ کے مطالعہ کا بڑا شوق تھا۔ شاعری سے بھی عشق تھا۔ اُس نے کئی استادوں کی شاگردی اختیار کی تھی۔ مگر اس کا سب سے بڑا اُستاد نورالدین زنگی تھا۔

وہ فطرتًا تنہائی پسند تھا۔ سلطان نورالدین نے کئی بڑی بڑی لڑائیاں لڑیں، جن میں شیرکوہ برابر شریک رہا۔ مگر ہم صلاح الدین کا نام کہیں نہیں

پڑھتے۔ سب سے پہلی جنگ جس میں وہ شامل ہؤا، وہ ہے جب شیرکوہ نے مصر پر حملہ کیا۔ یہ واقعہ ۱۱۶۴ء کا ہے۔ اس وقت مصر پر خلیفہ العاضد کی حکومت تھی۔ مگر وہ کمزور اور دوسروں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی بنا ہؤا تھا۔ پھر عیسائی وہاں حملہ کرنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ سلطان نورالدین کے لئے جو عیسائیوں کو اپنے ملک سے نکالنے کی کوشش کر رہا تھا، یہ ضروری تھا کہ اس کا مصر پر قبضہ ہو جاتا۔ اُسے اس کوشش میں کامیابی ہوئی۔ شیرکوہ یہاں کا وزیرِ اعظم مقرر ہؤا۔ اور اس کے انتقال کے بعد یہ عہدہ صلاح الدین کے ہاتھ آیا۔

سلطان نورالدین کے برسرِ اقتدار آنے سے پہلے عباسی خلافت جس کا دبدبہ کبھی دُور دُور تک پھیلا ہؤا تھا، کمزور ہو چکی تھی اور کئی حصوں میں بٹ گئی تھی۔ عیسائی جو مسلمانوں کے پُرانے دشمن تھے، اس موقع کی تاک میں تھے۔ اُنہوں نے دیکھا کہ مسلمانوں کا آپس میں اتفاق نہیں ہے، اور وہ غیر منظّم ہیں، تو اُنہوں نے ایک دم ایشیائے کوچک پر حملہ کر دیا۔ اور فتح پر فتح حاصل کرتے ہوئے ملک شام تک آ پہنچے۔ اور بیت المقدّس پر قبضہ کر لیا۔ اُنہوں نے یہاں چار ریاستیں قائم کیں۔ رہا، انطاکیہ، طرابلس اور بیت المقدّس۔ بیت المقدّس کی فتح سے مسلمانوں کو بڑا سخت دھکا لگا۔ تاریخ میں مسلمانوں اور عیسائیوں کی ان

لڑائیوں کو صلیبی لڑائیاں کہتے ہیں۔ یہ پہلی صلیبی جنگ تھی۔ بیت المقدس کا حاکم گاڈفرے کو مقرر کیا گیا اور باقی تینوں ریاستیں بھی اس کے ماتحت کر دی گئیں۔ مگر مسلمانوں کی یہ شکست عارضی تھی۔ عیسائیوں کے اس حملے سے اسلامی دُنیا کے ستون ہل گئے تھے مگر گرے نہیں تھے۔ مسلمانوں کو یقین تھا کہ خدا کا کوئی بندہ ضرور اُٹھے گا اور انہیں متحد کر کے عیسائیوں کو اسلامی سرزمین سے باہر نکال دے گا۔ اور واقعی ایسا ہوا۔ کئی اللہ کے شیر پیدا ہوئے جنہوں نے عیسائیوں کے ہوش ٹھکانے لگا دیئے۔ ان میں پہلا نمبر عماد الدین زنگی کا ہے، جس نے ۱۱۴۴ء میں عیسائیوں کو شکست دے کر ان کی ریاست رہا پر قبضہ کر لیا تھا۔ اس کے بعد سلطان نور الدین اُٹھا، جس نے اپنی ساری زندگی جہاد کے لئے وقف کر دی۔ رہا کی شکست کے بعد عیسائیوں نے دوسری جنگِ صلیبی کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ آپ کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ اس میں یورپ کے بڑے بڑے بادشاہ اپنی فوجیں بھیجتے تھے اور عیسائیوں کا دینی پیشوا پوپ بھی ان کی پوری مدد کرتا تھا۔ چنانچہ دوسری صلیبی جنگ کے لئے بھی انہوں نے ایک بہت بڑا لشکر جمع کر لیا تھا۔ مگر سلطان نور الدین نے ان کی ایک نہ چلنے دی۔ اس نے عیسائیوں کا طوفان پیچھے کی طرف دھکیل دیا۔ ایک طرف اس نے ایک عظیم الشان سلطنت قائم کر دی اور دوسری

طرف صلیبیوں کو روک کر ان کی فتوحات کا سلسلہ ختم کر دیا۔ سلطان کی وفات ایک بہت بڑا سانحہ تھا۔ اس میں بے شمار خوبیاں تھیں۔ وہ واقعی خدا کی راہ میں مجاہد تھا۔ مورخ لکھتے ہیں کہ خلفائے راشدین، اور حضرت عمر بن عبدالعزیز کے سوا کوئی اور بہتر فرماں روا ان کی نظر سے نہیں گزرا۔

سلطان نورالدین کی وفات پر عیسائیوں میں بڑی خوشیاں منائی گئیں۔ اُنہوں نے اپنی کوششیں پھر سے شروع کر دیں۔ چنانچہ شام سے ان کی فوجیں حرکت میں آئیں، اور دمشق کے قریب پہنچ گئیں۔ یہاں نورالدین کے بیٹے اور ان کے وزیر کمزور تھے۔ اُنہوں نے صلح کر لی۔ اس سے عیسائیوں کے حوصلے اور بڑھ گئے، اور اُنہوں نے فیصلہ کر لیا کہ سب سے پہلے مصر پر حملہ کر کے اسے ختم کر دینا چاہیے۔ چنانچہ اُنہوں نے ایک بڑا جنگی بیڑا جس میں ۲۸۲ جہاز تھے جمع کیا، اور مصر کی بندرگاہ اسکندریہ پر دھاوا بول دیا۔ صلاح الدین نے جو وہاں کا وزیر اعظم اور مختارِ کُل تھا، یہ خبر سنی تو جلدی سے ایک لشکر وہاں بھیج دیا۔ عیسائیوں کو شکست ہوئی، اور ان کے کئی جہاز سمندر میں ڈوب گئے۔

سُلطان نورالدین کے انتقال کے بعد اس کے بیٹوں اور رشتہ داروں نے الگ الگ حکومتیں قائم کر لی تھیں۔ اسکندریہ کے واقعہ کے بعد صلاح الدین کو اس بات کا سختی سے احساس ہوا کہ جب تک وہ ساری

ریاستوں کو ایک ۔۔۔ کے ان کا اندرونی انتظام ٹھیک نہیں کرے گا اس وقت تک عیسائیوں کے مقابلے میں کامیابی مشکل ہوگی ۔ مگر وقت یہ تھی کہ کئی ریاستوں کے حاکم اس کا ساتھ دینے کو تیار نہیں تھے ۔ وہ اکثر دشمن سے بھی مل جاتے تھے ۔ اس لئے صلاح الدین کو مجبور ہو کر انہیں اپنے قبضہ میں کرنا پڑا کسی کو ڈانٹ ڈپٹ بنائی وہ کسی سے مروت کا سلوک کیا ۔ ۱۱۷۴ء سے ۱۱۸۶ء تک یعنی تقریباً ۱۲ سال اسی کوشش میں صرف ہوئے ۔ یہ نہیں کہ اس عرصہ میں عیسائیوں کے ساتھ اس کی ایک لڑائی بھی نہ ہوئی ہو ۔ اس عرصہ میں کئی چھوٹی چھوٹی جھڑپیں ہوئیں جن میں کبھی صلاح الدین کو فتح ہوئی اور کبھی عیسائیوں کو ۔ مگر صلاح الدین نے اس کی طرف کوئی زیادہ توجہ نہ دی ۔ اس کا پہلا مقصد تو یہ تھا کہ ایک مضبوط حکومت قائم کی جائے اور مدافعت وحفاظت کا پورا پورا انتظام کیا جائے ۔ اس مقصد میں بالآخر وہ کامیاب ہوا ۔ چنانچہ اس نے ایک بہت بڑی متحدہ سلطنت قائم کر لی ۔ اس کی حدیں جنوب میں سوڈان کی آخری سرحد تک ، مغرب میں برقہ تک ، شمال میں آرمینیا تک اور مشرق میں جزیرہ اور موصل تک پہنچتی تھیں ۔ اب وہ سلطان صلاح الدین تھا ۔ ادھر دشمنوں میں طرابلس الشام کا حاکم ریمنڈ بڑا لائق اور بہادر تھا ۔ کرک کا والی ریجی نالڈ بھی بڑا دلیر تھا مگر اس میں خرابی یہ تھی کہ خواہ مخواہ لڑائی مول لیتا تھا ۔ اور معاہدوں کی پابندی

نہیں کرتا تھا۔

سلطان صلاح الدّین کو خون بہانے کا شوق نہیں تھا۔ مگر وہ مجبور تھا۔ حالات ایسے تھے کہ اس کے لئے لڑنا ضروری تھا۔ جب وہ ہر طرح سے مضبوط ہو گیا تو اس نے فیصلہ کر لیا کہ عیسائیوں کو بحرِ روم کے دُوسرے کنارے پر جسے وہ عبور کر کے آئے تھے ادھکیل دے۔ دوسری طرف عیسائی اس کوشش میں تھے کہ اپنے اس نئے دشمن کو کچل کر رکھ دیں۔ ان میں ریجی نالڈ پیش پیش تھا۔ اس میں اور سلطان صلاح الدّین میں چار سال کے لئے یعنی ۱۱۸۴ء سے ۱۱۸۵ء تک عارضی صُلح ہو چُکی تھی۔ مگر ریجی نالڈ اس عارضی صلح سے اُکتا چکا تھا۔ چنانچہ اس نے معاہدہ کے خلاف ایک قافلہ جو کرک کے قریب سے گزر رہا تھا، لُوٹ لیا۔ بہت سے لوگ قید ہو گئے اور قتل کر دیئے گئے۔ صلاح الدّین کو اس کی اطلاع ہوئی تو اسے بہت غصہ آیا، اور اس نے قسم کھائی کہ اگر ریجی نالڈ کبھی اس کے ہاتھ آیا، تو اُسے اپنے ہاتھوں سے قتل کرے گا۔

۱۱۸۷ء کی گرمیوں میں سلطان نے جہاد کی عام منادی کرا دی اور اپنے ماتحت حاکموں اور بادشاہوں کو حُکم دیا، کہ اپنا اپنا لشکر لے کر اس کے پاس پہنچ جائیں۔ چند دنوں میں ایک بڑا لشکر جمع ہو گیا۔ اُدھر عیسائیوں نے بھی خوب تیاریاں کر لی تھیں۔ پچاس ہزار عیسائی صفوریہ

مشہور شہر میں مسلمانوں کے مقابلے کے لئے جمع ہوئے۔

سلطان نے صفوریہ کا رُخ کیا۔ یہ جمعہ کا دن تھا۔ اور وہ اکثر لڑائیوں کے لئے جمعہ کا مبارک دن ہی پسند کیا کرتا تھا۔ راستہ میں عیسائیوں کا ایک مرکز طبریہ پڑتا تھا۔ مسلمانوں نے شہر پر تو قبضہ کر لیا، مگر طبریہ کا قلعہ فتح نہ کر سکے۔ جب عیسائیوں نے سُنا کہ طبریہ کا شہر ان کے ہاتھ سے نکل گیا ہے تو وہ صفوریہ سے قلعہ والوں کی مدد کو روانہ ہوئے۔ اِدھر صلاح الدین نے بھی پھُرتی سے طبریہ کو چھوڑ کر دشمن کا رُخ کیا۔ لشکر کو پانی کے کنارے اُتارا، اور اس کے سامنے پانی کے جو جوہڑ تھے، وہ سب خشک کروا دیئے۔ بڑی شدید گرمی پڑ رہی تھی۔ عیسائیوں کو پانی کی بڑی دشواری پیش آئی۔ مگر وہ کسی نہ کسی طرح اسلامی لشکر کے قریب پہنچ کر ٹھہر گئے۔ مسلمان سپاہیوں نے کچھ رات خدا کی عبادت اور کچھ آرام میں گزاری، اور صلاح الدین نے انہیں ضروری ہدایات اور احکام دیئے۔

دوسرے روز عیسائیوں کی یہ کوشش تھی کہ کسی نہ کسی طرح پانی تک پہنچ جائے۔ صلاح الدین کو پہلے ہی معلوم تھا کہ ایسی کوشش ہو گی۔ چنانچہ اس نے انہیں ناکام بنانے کی ٹھان لی۔ اس نے چکر دے دلا کر ان کو ایک دائرے میں جکڑ لیا۔ اس دائرے سے نکلنا بہت دشوار تھا۔ اُنہوں نے لڑ بھڑ کر بحیرۂ طبریہ کی طرف نکل جانا چاہا۔ لیکن صلاح الدین خود سامنے آکر

جم گیا۔ عیسائیوں نے بھی پورا زور صرف کر دیا۔ بڑی خونریز جنگ ہوئی
صلاح الدین فوج کے ہر حصہ میں جا کر سپاہیوں کو جوش دلاتا اور انہیں
ضروری ہدایتیں دیتا تھا۔ جب عیسائیوں نے دیکھا کہ بچنے کی کوئی صورت
نہیں ہے تو انہوں نے آخری مقابلے کے لئے جان کی بازی لگا دی
ان کے لگاتار حملوں سے مسلمانوں کی صفیں درہم برہم ہو گئیں۔ مگر ہر
حملہ میں عیسائیوں کی کافی تعداد قتل ہو جاتی تھی۔ اور ان کی قوت برابر
گھٹتی جاتی تھی۔ آخر مسلمانوں نے ان کو ہر طرف سے گھیر لیا۔ انہوں نے
کوہ حطین کی پناہ لینے کی کوشش کی لیکن ہر طرف سے راستہ بند تھا۔
بہت تھوڑی سی فوج کوہ حطین کی سمت جا سکی۔ مسلمانوں نے چاروں
طرف سے حملہ کر کے مقدس صلیب کو جو حضرت مسیح کی سولی کی شکل کی بنی ہوئی
تھی، چھین لیا۔ اس سے عیسائیوں میں بڑی بے دلی پھیل گئی اور انہوں
نے مقابلہ کی آخری کوشش کی۔ مگر وہ مسلمانوں کے حملہ کو نہ روک سکے۔
مسلمان بڑھتے ہوئے شاہ بیت المقدس گائی کے خیمہ تک جا پہنچے۔ اور اس
کو گرا دیا۔ عیسائیوں نے جب دیکھا کہ ان کی قوت بالکل جواب دے چکی ہے
اور جنگ جاری رکھنے میں موت کے سوا کچھ حاصل نہیں ہے تو انہوں نے
ہتھیار ڈال دیے۔ مسلمانوں نے بادشاہ گائی، ریجی نالڈ اور کئی بڑے بڑے
امیروں کو گرفتار کر لیا۔ قیدیوں کی یہ کثرت تھی کہ ان پر نظر پڑتی تو خیال گزرتا

کہ سارا عیسائی لشکر پکڑا گیا ہے۔ ادھر میدان جنگ میں پڑی ہوئی لاشیں نظر آتیں تو اندازہ ہوتا کہ زندہ کوئی نہیں بچا ہوگا۔

جنگ ختم ہونے کے بعد معزز قیدی سلطان کے سامنے پیش کئے گئے۔ بادشاہ گائی کو اس نے اپنے پہلو میں جگہ دی۔ باقی امیروں کو بھی ان کے رتبہ کے مطابق بٹھایا۔ یہ بیان ہو چکا ہے کہ سلطان صلاح الدین نے قسم کھائی تھی کہ اگر ریجی نالڈ اس کے قبضہ میں آیا، تو اسے اپنے ہاتھوں سے قتل کرے گا۔ چنانچہ پہلے اس نے اس کے سامنے اسلام پیش کیا، اس کے انکار کے بعد اپنے ہاتھوں سے اس کا سر اڑا کر اپنی قسم پوری کی۔ ریجی نالڈ کا انجام دیکھ کر گائی ڈر گیا۔ سلطان نے اس کو اطمینان دلایا، اور کہا۔ "بادشاہوں کا یہ دستور نہیں ہے کہ وہ دوسرے بادشاہ کو قتل کریں۔ ریجی نالڈ کو تو خود اپنی زیادتیوں کی وجہ سے اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑا"۔

حطین کی شکست سے عیسائیوں کی قوت بہت کمزور پڑ گئی۔ اسلامی فوجوں نے حطین کی فتح کے بعد صرف ایک دن آرام کیا، اور پھر ایک زبردست سیلاب کی طرح ملک میں پھیلنا شروع کر دیا۔ اب ان فوجوں کے لئے اتنا کافی تھا کہ وہ کسی شہر کے سامنے آئیں، اور اس کی دیواریں گر پڑیں اور شہر کی فوج اپنے ہتھیار ڈال دے۔ صرف چند مضبوط قلعے ایسے تھے

جنہوں نے کچھ ہمت کی۔ لیکن اُن میں سے بھی کوئی قلعہ ایسا نہ تھا
نے ایک ہفتہ سے زیادہ مقابلہ کیا ہو۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے
پر قبضہ کیا گیا۔ پھر فلسطین کی بندرگاہ اور تجارت کی منڈی عکّا پر حملہ
وہاں کے باشندوں نے اطاعت قبول کر لی۔ سلطان نے انہیں اجا
دے دی کہ اگر وہ چاہیں تو عکّا ہی میں رہیں، اور اگر چاہیں، تو اپنا
لے کر نکل جائیں۔ عکّا کی جامع مسجد کو عیسائیوں نے گرجا بنا لیا تھا
سو سال بعد سلطان صلاح الدینؒ نے پھر اسے مسجد بنایا، اور یہاں جمعہ کی
ادا کی۔ اس کے بعد کئی اور چھوٹے چھوٹے شہر فتح ہوئے، اور ان کے
فلسطین کے خوبصورت اور مضبوط شہر بیروت پر قبضہ کر لیا گیا۔ بیروت
بعد ساحلی شہروں میں صور اور عسقلان دو بڑے شہر رہ گئے تھے۔ صور
کو نرینڈ تھا، اور اس کے پاس زبردست فوج تھی۔ اس کو فتح کرنے
لئے کچھ عرصہ درکار تھا، اس لئے سلطان نے عسقلان کا رُخ کیا۔ اور
کا محاصرہ کر لیا۔ مگر شہر والوں نے چند روز کے بعد جان کی امان چاہی
شہر مسلمانوں کے حوالے کر دیا۔

عسقلان کی فتح کے بعد بیت المقدس کا راستہ صاف ہو گیا
مگر اس پر قبضہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ وہاں بہت سے شکست کھ
ہوئے سپاہی جمع ہو گئے تھے جن کی تعداد ساٹھ ہزار سے اوپر تھی

مسلمانوں کے لئے بھی اتنا ہی معزز شہر تھا جتنا عیسائیوں کے لئے۔ اس لئے سلطان یہاں خونریزی پسند نہیں کرتا تھا۔ چنانچہ اس نے عیسائیوں کو پیغام بھیجا کہ شہر میرے حوالے کر دو، اور اس کے معاوضہ میں تم کو اتنا علاقہ دے دوں گا جتنا تم سنبھال سکو۔ مگر عیسائیوں نے انکار کر دیا۔ اب سلطان کو مجبوراً لڑنا پڑا۔ کئی دن تک پُر زور مقابلہ ہوتا رہا۔ مسلمان سپاہی شہر پناہ کو توڑنا چاہتے تھے لیکن اس کے اُوپر سے ان پر تیر چلائے جا رہے تھے۔ باہر بھی عیسائی سپاہی لڑ رہے تھے۔ اس لئے وہ شہر پناہ تک نہ پہنچ سکے۔ آخر ایک دفعہ ریلا کر کے مسلمانوں نے عیسائیوں کو اندر دھکیل دیا۔ بڑھتے ہوئے شہر پناہ تک پہنچ گئے اور بھاری پتھر مار کر اسے توڑ ڈالا۔ جب عیسائیوں نے دیکھا کہ وہ شہر کو نہیں بچا سکتے اور اُن کی موت یقینی ہے تو وہ جان و مال کی حفاظت کی شرط پر شہر حوالے کر دینے پر تیار ہو گئے۔ پہلے تو سلطان نے انکار کر دیا، پھر اس خیال سے کہ کہیں شہر کی بے حرمتی نہ ہو، وہ مان گیا۔ شرط یہ قرار پائی کہ بیت المقدس کے تمام عیسائی فی مرد دس دینار، فی عورت پانچ دینار اور فی بچہ دو دینار فدیہ ادا کریں گے، اور چالیس دن کے اندر جن کا فدیہ ادا نہ ہوگا وہ غلام شمار کئے جائیں گے۔ اس طرح پُورے اکانوے سال کے بعد خدا کا یہ گھر پھر مسلمانوں کے قبضہ میں آگیا۔ اتفاق دیکھئے کہ یہ تاریخ معراج نبوی کی ہے۔

آپ کو شاید معلوم ہو کہ جب عیسائیوں نے بیت المقدس پر قبضہ کیا تھا، تو اُنہوں نے مسلمانوں پر بڑے ظلم ڈھائے تھے۔ سلطان چاہتا، تو ان کا بدلہ لے سکتا تھا۔ مگر اس نے عیسائیوں سے بڑی فیاضی اور شرافت کا سلوک کیا۔ اِس بات کو عیسائی بھی مانتے ہیں۔

عیسائیوں نے ایک سو برس میں بیت المقدس کی حالت بگاڑ دی تھی۔ سلطان نے سب کچھ ٹھیک ٹھاک کیا۔ مسجد اقصٰی کو نجاستوں سے پاک کیا اور اس میں وہ خوبصورت منبر رکھوایا، جو سلطان نورالدین نے اپنے عہد میں بنوایا تھا کہ بیت المقدس کو فتح کر کے اس مسجد میں رکھوائے گا۔

بیت المقدس پر مسلمانوں کے قبضہ نے ساری عیسائی دُنیا میں ایک تہلکہ برپا کر دیا۔ اور تیسری جنگِ صلیبی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ اس کے لئے پادریوں نے یورپ کا دَورہ کر کے اپنی پُرجوش تقریروں سے مسلمانوں کے خلاف آگ لگا دی۔ پوپ نے فتویٰ دیا کہ جو شخص اس مقدس جنگ میں شریک ہو گا۔ اس کے سارے گناہ دُھل جائیں گے۔ غرض تھوڑے عرصے میں ایک بڑا لشکر تیار ہو گیا۔ فرانس، جرمنی، انگلستان، اٹلی اور سسلی بادشاہ اس میں شریک تھے۔ اتنے بادشاہوں نے پہلے کبھی کسی جنگ میں حصّہ نہیں لیا تھا۔ ان میں سے سب سے پیش پیش انگلستان کا بادشاہ رچرڈ تھا۔ اس عظیم الشّان لشکر نے سب سے پہلے عکّا کا محاصرہ کر لیا۔ سلطان

صلاح الدین نے پورے تین سال تک بڑی بہادری کے ساتھ یورپ کی اس متحدہ قوت کا مقابلہ کیا۔ اس مدت میں سو سے زیادہ لڑائیاں اور نو بڑے معرکے ہوئے۔ آخر سلطان نے شہر کو چند شرطوں پر عیسائیوں کے حوالے کر دیا۔ مگر افسوس ہے کہ عیسائیوں نے بہت سی شرطیں پوری نہیں کیں عکا پر قبضہ کرنے کے بعد عیسائیوں نے یافا جسے مسلمانوں نے خالی کر دیا تھا، اپنے قابو میں کر لیا۔ چونکہ سلطان عسقلان کی حفاظت نہ کر سکتا تھا اس لئے اسے برباد کرا دیا۔ اب عیسائی بیت المقدس کی طرف بڑھے مگر صلاح الدین نے اس کی حفاظت کا ایسا اعلےٰ انتظام کیا تھا کہ وہ ذرا سی بھی کامیابی حاصل نہ کر سکے۔ اِدھر اُدھر لڑائیاں ہوتی رہیں جو بے نتیجہ ثابت ہوئیں۔ اِن لڑائیوں سے تنگ آ کر کئی بادشاہ اور امیر یورپ واپس چلے گئے۔ مگر رچرڈ برابر میدان میں ڈٹا رہا۔ رچرڈ نے بیت المقدس فتح کرنے کی ہر ممکن کوشش کی مگر ناکام رہا۔ آخر تنگ آ کر اُسے صلح کرنا پڑی۔ صلح کی شرط یہ تھی کہ عکا سے لے کر یافا تک کے ساحل پر عیسائی قابض رہیں گے اور وہاں سے لے کر جنوب کا ساحلی علاقہ صلاح الدین کے قبضہ میں رہے گا۔

اس جنگ میں یورپ کے لاکھوں سپاہی، کئی بادشاہ اور سینکڑوں امیر کام آئے اور بے اندازہ دولت برباد ہوئی۔ اس کے مقابلہ میں عیسائیوں کو حاصل کچھ نہ ہوا۔ مسلمانوں کو بھی کافی نقصان اُٹھانا پڑا۔ لیکن ان

کو اس کے بدلے میں فلسطین کا قریب قریب پورا علاقہ مل گیا تیسری صلیبی جنگ میں تمام مسیحی دنیا کی مجموعی طاقت مقابلہ کرنے آئی مگر سلطان صلاح الدین کی قوت کو ٹس سے مس نہ کر سکی۔

صلح کے بعد سلطان نے فوجوں کو آرام دینے کے لئے ان کے وطن واپس کر دیا۔ اور خود چند مہینوں کے لئے فلسطین ٹھہر گیا، اور ضروری انتظام کرنے کے بعد دمشق واپس آ گیا۔ کئی سال سے اس کی صحت بگڑ رہی تھی مگر وہ جہاد میں اتنا مصروف تھا کہ آرام کا موقعہ ہی نہیں ملتا تھا۔ بیماری کی وجہ سے رمضان کے بہت سے روزے قضا ہو گئے تھے۔ دمشق آکر اُن کو پورا کرنا شروع کیا۔ طبیب نے روکا کہ صحت پر بُرا اثر پڑے گا۔ سلطان نے جواب دیا۔ معلوم نہیں آئندہ کیا پیش آئے، اور کُل روزے پورے کئے۔ اس سے صحت اور بگڑ گئی، اور بخار آنے لگا۔ آخر منگل کے دن ۴ مارچ ۱۱۹۳ء کو فجر کے وقت ہمیشہ کے لئے آنکھ بند کر لی۔ اس وقت کُل ۵۷ سال کی عمر تھی۔ غسل کے بعد عصر کے وقت اسی مکان میں جس میں بیمار تھا، اس مجاہدِ اعظم کو دفن کیا گیا۔ لاش کے ہمراہ وہ تلوار بھی رکھ دی گئی جو ہمیشہ خدا کی راہ میں بے نیام رہی۔ اب اس کو چلانے والا ہاتھ باقی نہ رہ گیا تھا۔

سلطان صلاح الدین کی موت سے اسلامی دُنیا میں صفِ ماتم بچھ گئی

دئی دل ایسا نہ تھا، جو اس غم میں رنجیدہ نہ ہُوا ہو، اور کوئی آنکھ ایسی
تھی جو اس کے ماتم میں روئی نہ ہو۔ میّت کو دفن کرنے کے بعد سب
پنے اپنے گھر چلے آئے، اور دروازے بند کر کے بیٹھ رہے۔ گلی کوچوں
ر بازاروں میں کوئی آدمی نظر نہ آتا تھا۔ قبر پر لوگ قرآن مجید پڑھتے
تے، رو رو کر خدا سے دعائیں مانگتے کہ جو شخص یہاں سوتا ہے اس پہ
دا کی رحمت ہمیشہ برستی رہے۔

سلطان صلاح الدین بڑا بہادر، نڈر اور مستقل مزاج تھا۔ کیسا
ی خطرناک مرحلہ کیوں نہ ہو، بالکل نہ گھبراتا تھا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ عیسائیوں
ی بہت بڑی تعداد ہے، اور ان کی امدادی فوجیں لگاتار آ رہی ہیں
یکن سلطان پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا بلکہ اس سے اس کی ہمّت
ور حوصلہ اور بڑھ جاتا تھا۔ وہ ہر سال سردی کے موسم میں فوجوں کو اُن
کے وطن واپس کر دیتا تھا، اور خود تھوڑی سی فوج کے ساتھ دشمن کا
مقابلہ کرتا رہتا تھا۔ جنگ کے زمانہ میں دشمنوں کی طاقت اور حالات کا
اندازہ لگانے کے لئے خطرے کی پروا کئے بغیر اُن کی لشکر گاہ کے گرد ایک
دو مرتبہ ضرور چکر لگاتا تھا۔ عین اس وقت جب لڑائی زوروں پر ہو رہی
ہوتی، فوج کی صفوں میں گھوم پھر کر ان کی ترتیب قائم کرتا اور سپاہیوں
کو ضروری ہدایتیں دیتا۔ اس سلسلہ میں دشمن کی صفوں کے بالکل قریب

پہنچ جاتا تھا۔ اس نے کبھی یہ پرواہی نہیں کی کہ دشمن کی تعداد زیادہ ہے
اور نہ اس کو کسی قسم کی اہمیت دی۔ مگر اس کے ساتھ ہی وہ جنگی تدبیروں
سے غافل نہ رہتا تھا۔ فوجی افسروں کی وہ رائیں سنتا اور جو اچھی ہوتی
اُس پر عمل بھی کرتا تھا۔

اس کی ساری عمر میدانِ جنگ ہی میں گزری۔ کئی بار سخت بیمار
ہُوا لیکن اس سے جہاد کی سرگرمی میں ذرا بھی فرق نہیں آیا۔ وہ ہمیشہ
جہاد ہی میں مصروف رہتا تھا، اور اس کے لئے بڑا انتظام کرتا تھا۔ اس
کو جہاد کا اتنا شوق تھا کہ اس کے دل و دماغ پر دن رات جہاد ہی چھایا
رہتا تھا۔ جہاد کے علاوہ نہ کسی اور مضمون پر بات کرتا، نہ دوسرا کام کرتا
جہاد کے ہتھیاروں کے علاوہ اور کسی ساز و سامان کی طرف نگاہ نہ اُٹھاتا
ہر وقت فوجی تیاریوں میں لگا رہتا تھا۔ غرض جہاد ہی اس کا اوڑھنا بچھونا
تھا۔ اس کے لئے اس نے اپنی بیوی، بچے، وطن، گھر بار اور آرام کے
سارے سامان چھوڑ دیئے تھے۔ بس خیمہ کی زندگی اختیار کر لی تھی جس کے
ہر طرف ہوا کے جھکڑ چل رہے ہوں۔ جہاد میں جتنی زیادہ مشکلیں اور دقتیں
پیش آتیں، اتنا ہی اس میں صبر و استقلال اور بڑھتا تھا۔ جو لوگ اس
کے زیادہ قریب رہنا چاہتے تھے، وہ جہاد کو اس کا وسیلہ بناتے تھے
یہ حال دیکھ کر کئی عالموں نے جہاد پر کتابیں لکھیں جنہیں سلطان پڑھا کرتا تھا

سلطان کی ہمت اور استقلال کا یہ حال تھا، کہ جس زمانے میں عکا کا محاصرہ کئے ہوئے تھا، تو پچھلے دھڑ میں بہت سے پھوڑے نکل آئے۔ اتنی تکلیف تھی کہ دسترخوان پر بھی نہ بیٹھا جاتا تھا۔ لیکن اسی حالت میں صبح سے ظہر تک اور عصر سے مغرب تک برابر گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھا رہتا تھا۔ جب لوگوں نے اس کے صبر اور برداشت پر حیرانی ظاہر کی، تو اس نے کہا: جب میں گھوڑے پر سوار ہو جاتا ہوں تو تکلیف ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن گھوڑے سے اُترتا ہوں تو پھر واپس آجاتی ہے۔ ایک مرتبہ سلطان بیمار تھا، عیسائیوں کو اس کی خبر ملی، تو وہ ایک شہر کی جانب بڑھے۔ سلطان اسی بیماری کی حالت میں ان کے مقابلے کو نکل کھڑا ہوا۔ گرمی بڑی سخت پڑ رہی تھی۔ سلطان نے دھوپ سے بچنے کے لئے چہرے پر رومال ڈال لیا تھا۔ تھوڑی دُور چل کر ٹھہر جاتا تھا۔ اس طرح اُس نے سارا راستہ طے کیا اور عیسائیوں کے قریب پہنچ کر ان کی تدبیر ناکام کر دی۔ اسی طرح ایک اور شہر کے محاصرہ کے زمانے میں سخت سردی پڑ رہی تھی۔ بارش ہونے سے سردی اور بھی چمک گئی تھی۔ سلطان نے ساری رات جاگ کر اپنے سامنے پانچ منجنیقیں لگوائیں۔

ایک مرتبہ کسی جنگ کے دَوران میں اس کے نوجوان بیٹے اسمٰعیل کی مَوت کی خبر ملی۔ سلطان نے یہ واقعہ کسی سے بیان نہ کیا۔ اور نہ یہ ظاہر

ہونے دیا کہ کیسا افسوسناک واقعہ ہُوا ہے۔ البتہ جب مُوت کی اطلاع کا خط پڑھتا تھا، تو آنکھوں میں آنسو آجاتے تھے۔ اسی طرح نوجوان بھتیجے تقی الدین عمر کی موت کی خبر آئی تو اتنا رنج ہُوا کہ ضبط کرنا مشکل ہو گیا۔ تقی الدین سے وہ بے حد محبّت کرتا تھا۔ مگر اُس نے صرف چند خاص لوگوں کو یہ خبر بتائی اور تاکید کر دی کہ عام نہ ہونے پائے۔ سلطان کو اپنے بچّوں سے بڑی محبت تھی، مگر خدا کی راہ میں سب کو چھوڑ دیا تھا۔

سلطان صلاح الدین صرف مجاہد ہی نہیں تھا، بلکہ اخلاق و کردار کا بھی مکمّل نمونہ تھا۔ اس میں بے شمار خوبیاں جمع تھیں۔ اُسے دینی احکام کی پابندی اور شریعت کی حفاظت کا بڑا خیال تھا۔ نمازِ باجماعت کا اتنا اہتمام تھا کہ برسوں تنہا پڑھنے کا اتفاق نہ ہُوا۔ بیماری کی حالت میں بھی امام کو گھر پر بُلا کر جماعت کے ساتھ نماز ادا کرتا تھا۔ جب تک اس کے ہوش و حواس قائم رہے نماز نہ چھُوٹی۔ سفر میں جس مقام پر نماز کا وقت آجاتا، سواری روک کر اُتر پڑتا اور نماز پڑھنے کے بعد آگے بڑھتا۔ اس کے پاس کبھی اتنا روپیہ جمع نہیں ہُوا کہ زکوٰۃ واجب ہوتی۔ روزے بڑی پابندی سے رکھتا تھا۔ آخر کے چند سالوں میں بیماری کی وجہ سے روزے قضا ہو گئے تھے مگر صحت کی خرابی کے باوجود وفات سے پہلے ان کو پُورا کر دیا۔ بلکہ جیسا کہ آپ پڑھ چکے ہیں، انہیں روزوں کی وجہ سے اس کی صحت بگڑ

ں۔ حج کا ہر سال ارادہ کرتا تھا مگر جہاد کی مشغولیت کی وجہ سے اس کا موقعہ
ملتا تھا۔ جب عیسائیوں سے صلح ہو گئی تو حج کے انتظام شروع کر دیئے
وقت کی تنگی اور روپے کی کمی کے باعث ایسا نہ ہو سکا۔ اس کو اگلے سال
ملتوی کر دیا مگر موت نے اُس کا موقع نہ دیا ؛

کلام مجید سننے کا بڑا شوق تھا۔ ہمیشہ اس قاری کو امام بناتا تھا،
نہ صرف عالم ہو بلکہ جس کی آواز بھی اچھی ہو۔ رات کو خاص مجلس میں اور
ن کو عام مجلس میں پابندی سے قرآن پڑھوا کر سنتا تھا۔ قرآن کی آیتیں
ن کر خدا کا خوف دِل میں پیدا ہو جاتا اور آنکھوں سے آنسو نکل آتے
تھے۔ حدیث بھی بڑے شوق سے سُنتا تھا۔ جب کسی بڑے محدث کا
ام سُنتا تو اُسے فوراً بلوا بھیجتا، اگر اُسے آنے میں کوئی مجبوری ہوتی تو خود
چلا جاتا۔ علماء اور مشائخ کی بڑی عزت کرتا تھا، اور انہیں تحفے اور ہدیے
دیتا تھا ؛

ان خوبیوں کے ساتھ ساتھ وہ بڑا عادل، رحمدل اور کمزوروں کا
مددگار تھا۔ کچھ بھی ہو، پیر اور جمعہ کو ضرور عدالت کرتا تھا۔ قاضی وہاں موجود
رہتے تھے۔ ہر ایک کے لئے عدالت کا دروازہ کھُلا رہتا تھا۔ سُلطان تک
پہنچنے کے لئے کسی وسیلہ کی ضرورت نہ تھی۔ اس کے انصاف کے کئی
واقعات مشہور ہیں۔ اِس معاملے میں وہ اپنے پرائے میں کوئی تمیز نہیں

کرتا تھا ۔

اس کی فیاضی اور سخاوت انتہا تک پہنچی ہوئی تھی ۔ مال خزانہ اس کے پاس کبھی جمع نہیں ہوا ۔ اس کی سخاوت ہمیشہ اُسے خیراتی کاموں میں خرچ کرنے پر مجبور کرتی تھی ۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ وفات کے وقت خزانے میں کُل ۴۷ درم چاندی کے تھے اور ایک ٹکڑا سونے کا ۔ اس کے علاوہ نہ اُس نے کوئی جاگیر چھوڑی ، نہ جائیداد ، نہ باغ ، نہ کوئی گاؤں نہ کچھ اور ۔ فیاضی اور سخاوت کی اِس سے بہتر مثال کہاں مل سکتی ہے ۔

حلم اور بردباری اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی ۔ ہر ایک کے ساتھ نرمی اور تحمل سے پیش آتا ۔ کبھی اس کی زبان سے کوئی گالی نہیں نکلی ۔ کسی خدمت گزار کو جھڑکنے کے لئے اس نے کبھی کرخت لہجہ اختیار نہیں کیا ۔ کسی ملازم سے کوئی بڑا ہی قصور ہو جاتا تو نرم انداز میں اُسے سمجھا لیتا تھا ۔ مہمانوں کی خواہ وہ مسلمان ہوں یا غیر مُسلم بڑی خاطر تواضع کرتا تھا ۔ کئی عیسائی حاکم اس کے پاس آئے جن کی مہمان داری میں اس نے کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی ۔ خود اُن کے خیمہ میں جا کر اُن کے ساتھ کھانا کھاتا تھا ۔

سلطان نے کبھی دھوکے سے کام نہیں لیا ۔ اپنی زبان سے نکالی ہوئی بات کا ہمیشہ پاس کرتا تھا ۔ ہمیشہ وہی وعدہ کیا ، جس کے پورا کرنے کا ارادہ دِل میں رکھتا تھا ۔ ان سب خوبیوں کے علاوہ وہ بڑا ملنسار ساتھی

اور بہت پاکیزہ مذاق کا مالک تھا۔ اس کی مجلس فحش باتوں سے پاک ہوا کرتی تھی۔ وہ سنجیدہ اور اچھی باتیں سننا پسند کرتا تھا۔

ان سب باتوں کے ساتھ سلطان صلاح الدین نے مسلمانوں کی فلاح و بہبود اور ان کی تمدنی اور علمی زندگی کے لئے بہت سے کام انجام دیئے جن کی تفصیل لمبی ہے۔ اپنی ساری سلطنت میں مدرسے اور کالج قائم کیے۔ بڑے بڑے شہروں میں مسافر خانے اور شفا خانے بنوائے۔ مسجدیں اور سرائیں تعمیر کرائیں۔ صوفیوں کے لئے خانقاہیں بنوائیں۔ ان کے وظیفے مقرر کیے۔ غرض اس نے اپنے عہد میں اتنے نیک کام کئے کہ اسلام کی تاریخ میں دوسری مثال نہیں ملتی۔ ایک مؤرخ نے بالکل صحیح لکھا ہے، کہ سلطان دین و دنیا دونوں میں سعید تھا۔

سلطان صلاح الدین پر خدا کی ہزار ہزار رحمتیں ہوں۔ آیئے۔ اس کے حق میں دعائے خیر کریں!

سلطان محمد ثانی
(فاتح قسطنطنیہ)

کہ سارا عیسائی لشکر پکڑا گیا ہے۔ ادھر میدانِ جنگ میں پڑی ہوئی لاشیں نظر آتیں تو اندازہ ہوتا کہ زندہ کوئی نہیں بچا ہوگا۔

جنگ ختم ہونے کے بعد معزز قیدی سلطان کے سامنے پیش کئے گئے۔ بادشاہ گائی کو اُس نے اپنے پہلو میں جگہ دی۔ باقی امیروں کو بھی ان کے رُتبہ کے مطابق بٹھایا۔ یہ بیان ہو چکا ہے کہ سلطان صلاح الدین نے قسم کھائی تھی کہ اگر ریجی نالڈ اس کے قبضہ میں آیا، تو اُسے اپنے ہاتھوں سے قتل کرے گا۔ چنانچہ پہلے اس نے اس کے سامنے اسلام پیش کیا۔ اس کے انکار کے بعد اپنے ہاتھوں سے اس کا سر اڑا کر اپنی قسم پوری کی۔ ریجی نالڈ کا انجام دیکھ کر گائی ڈر گیا۔ سلطان نے اس کو اطمینان دلایا، اور کہا۔ "بادشاہوں کا یہ دستور نہیں ہے کہ وہ دوسرے بادشاہ کو قتل کریں۔ ریجی نالڈ کو تو خود اپنی زیادتیوں کی وجہ سے اپنی جان سے ہاتھ دھونا پڑا"۔

حطین کی شکست سے عیسائیوں کی قوت بہت کمزور پڑ گئی۔ اسلامی فوجوں نے حطین کی فتح کے بعد صرف ایک دن آرام کیا، اور پھر ایک زبردست سیلاب کی طرح ملک میں پھیلنا شروع کر دیا۔ اب ان فوجوں کے لئے اتنا کافی تھا کہ وہ کسی شہر کے سامنے آئیں، اور اس کی دیواریں گر پڑیں اور شہر کی فوج اپنے ہتھیار ڈال دے۔ صرف چند مضبوط قلعے ایسے تھے

جنھوں نے کچھ ہمت کی۔ لیکن اُن میں سے بھی کوئی قلعہ ایسا نہ تھا، جس
نے ایک ہفتہ سے زیادہ مقابلہ کیا ہو۔ اِس سلسلہ میں سب سے پہلے
پر قبضہ کیا گیا۔ پھر فلسطین کی بندرگاہ اور تجارت کی منڈی عکّا پر حملہ
وہاں کے باشندوں نے اطاعت قبول کر لی۔ سلطان نے انہیں اجا
دے دی کہ اگر وہ چاہیں تو عکّا ہی میں رہیں، اور اگر چاہیں، تو اپنا
لے کر نکل جائیں۔ عکّا کی جامع مسجد کو عیسائیوں نے گرجا بنا لیا تھا۔
سَو سال بعد سلطان صلاح الدین نے پھر اسے مسجد بنایا، اور یہاں جمعہ کی
ادا کی۔ اس کے بعد کئی اور چھوٹے چھوٹے شہر فتح ہوئے، اور ان کے
فلسطین کے خوبصورت اور مضبوط شہر بیروت پر قبضہ کر لیا گیا۔ بیروت
بعد ساحلی شہروں میں صور اور عسقلان دو بڑے شہر رہ گئے تھے۔ صور کا
کونریڈ تھا، اور اس کے پاس زبردست فوج تھی۔ اس کو فتح کرنے
لئے کچھ عرصہ درکار تھا، اِس لئے سلطان نے عسقلان کا رُخ کیا۔ اور
کا محاصرہ کر لیا۔ مگر شہر والوں نے چند روز کے بعد جان کی امان چاہی
شہر مسلمانوں کے حوالے کر دیا۔

عسقلان کی فتح کے بعد بیت المقدس کا راستہ صاف ہو گیا
مگر اس پر قبضہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ وہاں بہت سے شکست کھائے
ہوئے سپاہی جمع ہو گئے تھے جن کی تعداد ساٹھ ہزار سے اوپر تھی۔ بیت المقدس

مسلمانوں کے لئے بھی اتنا ہی معزز شہر تھا جتنا عیسائیوں کے لئے۔ اس لئے سُلطان یہاں خونریزی پسند نہیں کرتا تھا۔ چنانچہ اس نے عیسائیوں کو پیغام بھیجا کہ شہر میرے حوالے کر دو، اور اس کے معاوضہ میں تم کو اتنا علاقہ دے دوں گا جتنا تم سنبھال سکو۔ مگر عیسائیوں نے انکار کر دیا۔ اب سُلطان کو مجبوراً لڑنا پڑا۔ کئی دن تک پُرزور مقابلہ ہوتا رہا۔ مسلمان سپاہی شہر پناہ کو توڑنا چاہتے تھے لیکن اس کے اُوپر سے ان پر تیر چلائے جا رہے تھے۔ باہر بھی عیسائی سپاہی لڑ رہے تھے۔ اِس لئے وہ شہر پناہ تک نہ پہنچ سکے۔ آخر ایک دفعہ ریلا کر کے مسلمانوں نے عیسائیوں کو اندر دھکیل دیا۔ بڑھتے ہوئے شہر پناہ تک پہنچ گئے اور بھاری پتھر مار کر اسے توڑ ڈالا۔ جب عیسائیوں نے دیکھا کہ وہ شہر کو نہیں بچا سکتے، اور اُن کی موت یقینی ہے تو وہ جان و مال کی حفاظت کی شرط پر شہر حوالے کر دینے پر تیار ہو گئے۔ پہلے تو سلطان نے انکار کر دیا، پھر اس خیال سے کہ کہیں شہر کی بے حرمتی نہ ہو، وہ مان گیا۔ شرط یہ قرار پائی کہ بیت المقدس کے تمام عیسائی فی مرد دس دینار، فی عورت پانچ دینار اور فی بچہ دو دینار فدیہ ادا کریں گے، اور چالیس دن کے اندر جن کا فدیہ ادا نہ ہوگا وہ غلام شمار کئے جائیں گے۔ اس طرح پُورے اکانوے سال کے بعد خدا کا یہ گھر پھر مسلمانوں کے قبضہ میں آگیا۔ اتفاق دیکھئے کہ یہ تاریخ معراج نبوی کی ہے۔

آپ کو شاید معلوم ہو کہ جب عیسائیوں نے بیت المقدس پر قبضہ کیا تھا، تو اُنہوں نے مسلمانوں پر بڑے ظلم ڈھائے تھے۔ سلطان چاہتا، تو ان کا بدلہ لے سکتا تھا۔ مگر اس نے عیسائیوں سے بڑی فیاضی اور شرافت کا سلوک کیا۔ اِس بات کو عیسائی بھی مانتے ہیں۔

عیسائیوں نے ایک سو برس میں بیت المقدس کی حالت بگاڑ دی تھی۔ سلطان نے سب کچھ ٹھیک ٹھاک کیا۔ مسجد اقصٰی کو نجاستوں سے پاک کیا اور اس میں وہ خوبصورت منبر رکھوایا، جو سلطان نورالدین نے اپنے عہد میں بنوایا تھا کہ بیت المقدس کو فتح کر کے اس مسجد میں رکھوائے گا۔

بیت المقدس پر مسلمانوں کے قبضہ نے ساری عیسائی دُنیا میں ایک تہلکہ برپا کر دیا۔ اور تیسری جنگِ صلیبی کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ اس کے لئے پادریوں نے یورپ کا دَورہ کر کے اپنی پُرجوش تقریروں سے مسلمانوں کے خلاف آگ لگا دی۔ پوپ نے فتویٰ دیا کہ جو شخص اس مقدس جنگ میں شریک ہوگا۔ اس کے سارے گناہ دُھل جائیں گے۔ غرض تھوڑے عرصہ میں ایک بڑا لشکر تیار ہو گیا۔ فرانس، جرمنی، انگلستان، اٹلی اور سسلی کے بادشاہ اس میں شریک تھے۔ اتنے بادشاہوں نے پہلے کبھی کسی جنگ میں حصّہ نہیں لیا تھا۔ ان میں سے سب سے پیش پیش انگلستان کا بادشاہ رچرڈ تھا۔ اس عظیم الشان لشکر نے سب سے پہلے عکا کا محاصرہ کر لیا۔ سلطان نے

صلاح الدین نے پورے تین سال تک بڑی بہادری کے ساتھ یورپ کی اس متحدہ قوت کا مقابلہ کیا۔ اس مدت میں سو سے زیادہ لڑائیاں اور نو بڑے معرکے ہوئے۔ آخر سلطان نے شہر کو چند شرطوں پر عیسائیوں کے حوالے کر دیا۔ مگر افسوس ہے کہ عیسائیوں نے بہت سی شرطیں پوری نہیں کیں عکا پر قبضہ کرنے کے بعد عیسائیوں نے یافا جسے مسلمانوں نے خالی کر دیا تھا، اپنے قابو میں کر لیا۔ چونکہ سلطان عسقلان کی حفاظت نہ کر سکتا تھا اس لئے اسے برباد کرا دیا۔ اب عیسائی بیت المقدس کی طرف بڑھے مگر صلاح الدین نے اس کی حفاظت کا ایسا اعلےٰ انتظام کیا تھا کہ وہ ذرا سی بھی کامیابی حاصل نہ کر سکے۔ ادھر اُدھر لڑائیاں ہوتی رہیں جو بے نتیجہ ثابت ہوئیں۔ ان لڑائیوں سے تنگ آکر کئی بادشاہ اور امیر یورپ واپس چلے گئے۔ مگر رچرڈ برابر میدان میں ڈٹا رہا۔ رچرڈ نے بیت المقدس فتح کرنے کی ہر ممکن کوشش کی مگر ناکام رہا۔ آخر تنگ آکر اُسے صلح کرنا پڑی۔ صلح کی شرط یہ تھی کہ عکا سے لے کر یافا تک کے ساحل پر عیسائی قابض رہیں گے اور وہاں سے لے کر جنوب کا ساحلی علاقہ صلاح الدین کے قبضہ میں رہے گا۔

اس جنگ میں یورپ کے لاکھوں سپاہی، کئی بادشاہ اور سینکڑوں امیر کام آئے اور بے اندازہ دولت برباد ہوئی۔ اس کے مقابلہ میں عیسائیوں کو حاصل کچھ نہ ہوا۔ مسلمانوں کو بھی کافی نقصان اُٹھانا پڑا۔ لیکن ان

کو اس کے بدلے میں فلسطین کا قریب قریب پورا علاقہ مل گیا۔ تیسری صلیبی جنگ میں تمام مسیحی دنیا کی مجموعی طاقت مقابلہ کرنے آئی مگر سلطان صلاح الدین کی قوت کو ٹس سے مس نہ کر سکی۔

صلح کے بعد سلطان نے فوجوں کو آرام دینے کے لئے ان کے وطن واپس کر دیا۔ اور خود چند مہینوں کے لئے فلسطین ٹھہر گیا، اور ضروری انتظام کرنے کے بعد دمشق واپس آ گیا۔ کئی سال سے اس کی صحت بگڑ رہی تھی مگر وہ جہاد میں اتنا مصروف تھا کہ آرام کا موقعہ ہی نہیں ملتا تھا۔ بیماری کی وجہ سے رمضان کے بہت سے روزے قضا ہو گئے تھے۔ دمشق آ کر ان کو پورا کرنا شروع کیا۔ طبیب نے روکا کہ صحت پر برا اثر پڑے گا۔ سلطان نے جواب دیا۔ معلوم نہیں آئندہ کیا پیش آئے، اور کل روزے پورے کئے۔ اس سے صحت اور بگڑ گئی، اور بخار آنے لگا۔ آخر منگل کے دن ۴ مارچ ۱۱۹۳ء کو فجر کے وقت ہمیشہ کے لئے آنکھ بند کر لی۔ اس وقت کل ۵۷ سال کی عمر تھی۔ غسل کے بعد عصر کے وقت اسی مکان میں جس میں بیمار تھا، اس مجاہد اعظم کو دفن کیا گیا۔ لاش کے ہمراہ وہ تلوار بھی رکھ دی گئی جو ہمیشہ خدا کی راہ میں بے نیام رہی۔ اب اس کو چلانے والا ہاتھ باقی نہ رہ گیا تھا۔

سلطان صلاح الدین کی موت سے اسلامی دنیا میں صف ماتم بچھ گئی

کوئی دل ایسا نہ تھا، جو اس غم میں رنجیدہ نہ ہوا ہو، اور کوئی آنکھ ایسی نہ تھی جو اس کے ماتم میں روئی نہ ہو۔ میت کو دفن کرنے کے بعد سب اپنے اپنے گھر چلے آئے، اور دروازے بند کر کے بیٹھ رہے۔ گلی کوچوں اور بازاروں میں کوئی آدمی نظر نہ آتا تھا۔ قبر پر لوگ قرآن مجید پڑھتے رہتے، رو رو کر خدا سے دعائیں مانگتے کہ جو شخص یہاں سوتا ہے اس پر خدا کی رحمت ہمیشہ برستی رہے۔"

سلطان صلاح الدین بڑا بہادر، نڈر اور مستقل مزاج تھا۔ کیسا ہی خطرناک مرحلہ کیوں نہ ہو، بالکل نہ گھبراتا تھا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ عیسائیوں کی بہت بڑی تعداد ہے، اور ان کی امدادی فوجیں لگاتار آ رہی ہیں لیکن سلطان پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا بلکہ اس سے اس کی ہمّت اور حوصلہ اور بڑھ جاتا تھا۔ وہ ہر سال سردی کے موسم میں فوجوں کو اُن کے وطن واپس کر دیتا تھا، اور خود تھوڑی سی فوج کے ساتھ دشمن کا مقابلہ کرتا رہتا تھا۔ جنگ کے زمانہ میں دشمنوں کی طاقت اور حالات کا اندازہ لگانے کے لئے خطرے کی پروا کیئے بغیر اُن کی لشکرگاہ کے گرد ایک دو مرتبہ ضرور چکر لگاتا تھا۔ عین اس وقت جب لڑائی زوروں پر ہو رہی ہوتی، فوج کی صفوں میں گھوم پھر کر ان کی ترتیب قائم کرتا، اور سپاہیوں کو ضروری ہدایتیں دیتا۔ اس سلسلہ میں دشمن کی صفوں سے بالکل قریب

پہنچ جاتا تھا۔ اس نے کبھی یہ پرواہی نہیں کی کہ دشمن کی تعداد زیادہ ہے اور نہ اس کو کسی قسم کی اہمیت دی۔ مگر اس کے ساتھ ہی وہ جنگی تدبیروں سے غافل نہ رہتا تھا۔ فوجی افسروں کی وہ رائیں سُنتا اور جو اچھی ہوتی اُس پر عمل بھی کرتا تھا۔

اس کی ساری عمر میدانِ جنگ ہی میں گزری۔ کئی بار سخت بیمار ہوُا لیکن اس سے جہاد کی سرگرمی میں ذرا بھی فرق نہیں آیا۔ وہ ہمیشہ جہاد ہی میں مصروف رہتا تھا، اور اس کے لئے بڑا انتظام کرتا تھا۔ آپ کو جہاد کا اتنا شوق تھا کہ اس کے دل ودماغ پر دن رات جہاد ہی چھایا رہتا تھا۔ جہاد کے علاوہ نہ کسی اور مضمون پر بات کرتا، نہ دوسرا کام کرتا جہاد کے ہتھیاروں کے علاوہ اور کسی ساز وسامان کی طرف نگاہ نہ اٹھاتا ہر وقت فوجی تیاریوں میں لگا رہتا تھا۔ غرض جہاد ہی اس کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ اس کے لئے اس نے اپنی بیوی، بچے، وطن، گھر بار اور آرام کے سارے سامان چھوڑ دیئے تھے۔ بس خیمہ کی زندگی اختیار کر لی تھی جس کے ہر طرف ہوا کے جھکڑ چل رہے ہوں۔ جہاد میں جتنی زیادہ مشکلیں اور دِقتیں پیش آتیں، اتنا ہی اس میں صبر و استقلال اور بڑھتا تھا۔ جو لوگ اس کے زیادہ قریب رہنا چاہتے تھے، وہ جہاد کو اس کا وسیلہ بناتے تھے یہ حال دیکھ کر کئی عالموں نے جہاد پر کتابیں لکھیں جنہیں سُلطان پڑھا کرتا تھا

ہونے دیا کہ کیسا افسوسناک واقعہ ہوا ہے۔ البتہ جب موت کی اطلاع کا خط پڑھتا تھا، تو آنکھوں میں آنسو آجاتے تھے۔ اسی طرح نوجوان بھتیجے تقی الدین عمر کی موت کی خبر آئی تو اتنا رنج ہوا کہ ضبط کرنا مشکل ہو گیا۔ تقی الدین سے وہ بے حد محبت کرتا تھا۔ مگر اُس نے صرف چند خاص لوگوں کو یہ خبر بتائی اور تاکید کر دی کہ عام نہ ہونے پائے۔ سلطان کو اپنے بچوں سے بڑی محبت تھی مگر خدا کی راہ میں سب کو چھوڑ دیا تھا۔

سلطان صلاح الدین صرف مجاہد ہی نہیں تھا، بلکہ اخلاق و کردار کا بھی مکمل نمونہ تھا۔ اس میں بے شمار خوبیاں جمع تھیں۔ اُسے دینی احکام کی پابندی اور شریعت کی حفاظت کا بڑا خیال تھا۔ نمازِ باجماعت کا اتنا اہتمام تھا کہ برسوں تنہا پڑھنے کا اتفاق نہ ہوا۔ بیماری کی حالت میں بھی امام کو گھر پر بُلا کر جماعت کے ساتھ نماز ادا کرتا تھا۔ جب تک اس کے ہوش و حواس قائم رہے نماز نہ چھوٹی۔ سفر میں جس مقام پر نماز کا وقت آ جاتا، سواری روک کر اُتر پڑتا اور نماز پڑھنے کے بعد آگے بڑھتا۔ اس کے پاس کبھی اتنا روپیہ جمع نہیں ہوا کہ زکوٰۃ واجب ہوتی۔ روزے بڑی پابندی سے رکھتا تھا۔ آخر کے چند سالوں میں بیماری کی وجہ سے روزے قضا ہو گئے تھے مگر صحت کی خرابی کے باوجود وفات سے پہلے ان کو پورا کر دیا۔ بلکہ جیسا کہ آپ پڑھ چکے ہیں، انہیں روزوں کی وجہ سے اس کی صحت بگڑ

تی۔ حج کا ہر سال ارادہ کرتا تھا مگر جہاد کی مشغولیت کی وجہ سے اس کا موقعہ
ملتا تھا۔ جب عیسائیوں سے صلح ہو گئی تو حج کے انتظام شروع کر دیئے
ر وقت کی تنگی اور روپے کی کمی کے باعث ایسا نہ ہو سکا۔ اس کو اگلے سال
پر ملتوی کر دیا مگر موت نے اُس کا موقع نہ دیا۔

کلام مجید سُننے کا بڑا شوق تھا۔ ہمیشہ اس قاری کو امام بناتا تھا،
جو نہ صرف عالم ہو بلکہ جس کی آواز بھی اچھی ہو۔ رات کو خاص مجلس میں اور
دن کو عام مجلس میں پابندی سے قرآن پڑھوا کر سُنتا تھا۔ قرآن کی آیتیں
سُن کر خدا کا خوف دِل میں پیدا ہو جاتا اور آنکھوں سے آنسو نکل آتے
تھے۔ حدیث بھی بڑے شوق سے سُنتا تھا۔ جب کسی بڑے محدث کا
نام سُنتا تو اُسے فوراً بلوا بھیجتا، اگر اُسے آنے میں کوئی مجبوری ہوتی تو خود
چلا جاتا۔ علما، اور مشائخ کی بڑی عزت کرتا تھا، اور انہیں تحفے اور ہدیے
دیتا تھا۔

ان خوبیوں کے ساتھ ساتھ وہ بڑا عادل، رحمدل اور کمزوروں کا
مددگار تھا۔ کچھ بھی ہو، پیر اور جُمعہ کو ضرور عدالت کرتا تھا۔ قاضی وہاں موجود
رہتے تھے۔ ہر ایک کے لئے عدالت کا دروازہ کُھلا رہتا تھا۔ سُلطان تک
پہنچنے کے لئے کسی وسیلہ کی ضرورت نہ تھی۔ اس کے انصاف کے کئی
واقعات مشہور ہیں۔ اِس معاملے میں وہ اپنے پرائے میں کوئی تمیز نہیں

کرتا تھا۔

اس کی فیاضی اور سخاوت انتہا تک پہنچی ہوئی تھی۔ مال خزانہ اس کے پاس کبھی جمع نہیں ہوا۔ اس کی سخاوت ہمیشہ اُسے خیراتی کاموں میں خرچ کرنے پر مجبور کرتی تھی۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ وفات کے وقت خزانے میں کُل ۴۷ درم چاندی کے تھے اور ایک ٹکڑا سونے کا۔ اس کے علاوہ نہ اُس نے کوئی جاگیر چھوڑی، نہ جائیداد، نہ باغ، نہ کوئی گاؤں نہ کچھ اور فیاضی اور سخاوت کی اس سے بہتر مثال کہاں مل سکتی ہے؟

حلم اور بردباری اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ہر ایک کے ساتھ نرمی اور تحمل سے پیش آتا۔ کبھی اس کی زبان سے کوئی گالی نہیں نکلی۔ کسی خدمت گزار کو جھڑکنے کے لئے اس نے کبھی کرخت لہجہ اختیار نہیں کیا۔ کبھی ملازم سے کوئی بڑا ہی قصور ہو جاتا تو نرم انداز میں اُسے سمجھا لیتا تھا۔ مہمانوں کی خواہ وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم بڑی خاطر تواضع کرتا تھا۔ کئی عیسائی حاکم اس کے پاس آئے جن کی مہمان داری میں اس نے کوئی کسر نہ اُٹھا رکھی۔ خود ان کے خیمہ میں جا کر اُن کے ساتھ کھانا کھاتا تھا۔

سلطان نے کبھی دھوکے سے کام نہیں لیا۔ اپنی زبان سے نکلی ہوئی بات کا ہمیشہ پاس کرتا تھا۔ ہمیشہ وہی وعدہ کیا، جس کے پورا کرنے کا ارادہ دِل میں رکھتا تھا۔ ان سب خوبیوں کے علاوہ وہ بڑا ملنسار ساتھ

اور بہت پاکیزہ مذاق کا مالک تھا۔ اس کی مجلس فحش باتوں سے پاک ہوا کرتی تھی۔ وہ سنجیدہ اور اچھی باتیں سننا پسند کرتا تھا۔

اِن سب باتوں کے ساتھ سلطان صلاح الدین نے مسلمانوں کی فلاح و بہبود اور ان کی تمدّنی اور علمی زندگی کے لئے بہت سے کام انجام دیئے جن کی تفصیل لمبی ہے۔ اپنی ساری سلطنت میں مدرسے اور کالج قائم کئے۔ بڑے بڑے شہروں میں مسافر خانے اور شفا خانے بنوائے۔ مسجدیں و سرائیں تعمیر کرائیں۔ صوفیوں کے لئے خانقاہیں بنوائیں۔ ان کے وظیفے مقرر کئے۔ غرض اس نے اپنے عہد میں اتنے نیک کام کئے کہ اسلام کی تاریخ میں دوسری مثال نہیں ملتی۔ ایک مؤرخ نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ سلطان دین و دُنیا دونوں میں سعید تھا۔

سلطان صلاح الدین پر خدا کی ہزار ہزار رحمتیں ہوں۔ آیئے۔ اس کے حق میں دعائے خیر کریں!

سلطان محمد ثانی
(فاتح قسطنطنیہ)

سلطان سلیمان اعظم

(فاتح ہنگری)

سلطان سلیمان اعظم

"وہ خاندانِ عثمانیہ کا سب سے بڑا بادشاہ
اور اس وقت تمام دُنیا کا سب سے بڑا
شہنشاہ تھا۔"

ایک یورپین مورخ نے یہ الفاظ سلطان سلیمان اعظم کے متعلق لکھے ہیں اور جو کچھ اس نے لکھا ہے وہ بالکل صحیح ہے۔ وہ واقعی اپنے زمانہ میں تمام دُنیا کے بادشاہوں میں سب سے بڑا تھا۔ اور فتوحات اور سلطنت کی وسعت کے حساب سے اُن سب سے بڑھ گیا تھا۔ اس کے عہد میں سلطنتِ عثمانیہ اپنے انتہائی عروج پر پہنچ گئی تھی۔

سلطان سلیمان چھبیس برس کی عمر میں تخت پر بیٹھا۔ وہ بہت عرصہ ترکی میں مختلف صوبوں کا حاکم رہ چکا تھا۔ اپنے والد سلطان سلیم کی غیر حاضری میں

وہ قسطنطنیہ میں اس کی نمائندگی بھی کر چکا تھا۔ اس کے علاوہ اور بھی حکومت کے کئی کام اس کے سپرد ہوئے تھے جنہیں اس نے نہایت کامیابی سے سرانجام دیا تھا۔ اس لئے جب وہ تخت پر بیٹھا تو ایک نہایت لائق بادشاہ اور کامیاب منتظم ثابت ہؤا۔ اِن باتوں کے ساتھ ہی اس کی اپنی زندگی بالکل بے داغ تھی۔ وہ بہت رحم دل اور ہمدرد تھا۔ اس کے انصاف کی شہرت مُلک بھر میں پھیلی ہوئی تھی۔ اس کی عدالت میں نسل، رنگ اور مذہب کی کوئی تفریق نہ تھی۔ اسے دن رات رعایا کی بہبودی کا خیال رہتا تھا۔ چنانچہ جب وہ بادشاہ بنا تو تمام رعایا نے بڑی خوشی کے ساتھ اس کا استقبال کیا۔ اپنی حکومت کے پہلے ہی سال اس نے انصاف اور رحمدلی کی ایسی مثالیں پیش کیں کہ اُس کی ہر دلعزیزی بہت بڑھ گئی۔ اس نے تمام گورنروں کو حکم بھیجا کہ رعایا کے ساتھ کسی قسم کی زیادتی اور ظلم نہ کیا جائے۔ امیر، غریب، مُسلم اور غیر مُسلم سب کے ساتھ یکساں طور پر انصاف ہو۔ اس حکم کی بدولت مُلک میں ہر طرف امن و امان ہو گیا۔ کہیں ایک دو شورشیں ضرور ہوئیں لیکن انہیں سختی اور آسانی سے دبا دیا گیا۔

جب سلیمان کا عہدِ حکومت شروع ہؤا، تو اس وقت یورپ کی سلطنتوں نے بڑی ترقی کر لی تھی۔ اُنھوں نے جدید ہتھیاروں کے ساتھ اپنی فوجوں کو منظم کر لیا تھا۔ ان کے دلوں میں یہ جذبہ پیدا ہو گیا تھا، کہ

مسلمانوں کو نیچا دکھایا جائے۔ اس وقت یورپ میں تین مُلک خاص طور سے مشہور تھے۔ ایک ہنگری، جس کے پاس بہت بڑی فوج تھی۔ اور جس کی سرحدیں ترکی سلطنت کے ساتھ ملی ہوئی تھیں۔ آسٹریا کی سلطنت تو بہت مضبوط تھی اور وہ یورپ کے آدھے سے زیادہ حصّے پر پھیلی ہوئی تھی۔ یہاں کے بادشاہ کا نام چارلس پنجم تھا۔ فرانس بھی اپنی خانہ جنگیوں کو ختم کر کے دوسرے ملکوں کی فتوحات کے لئے نکل چکا تھا۔ ان کے علاوہ ایران خواہ مخواہ ترکوں کا دشمن ہو گیا تھا، حالانکہ دونوں اسلامی سلطنتیں تھیں۔ یہ حالات تھے جن سے سلطان سلیمان کو واسطہ پڑا۔

سلطان سلیم کے دورِ حکومت کے آخری سالوں میں سلطنتِ عثمانیہ اور سلطنتِ ہنگری کے درمیان لڑائی جھگڑا شروع ہو گیا تھا، اور سرحدی علاقہ میں برابر چھوٹی چھوٹی جھڑپیں ہوتی رہتی تھیں۔ اِس فتنہ کو دُور کرنے کے لئے سلیمان کے لئے ضروری تھا کہ وہ دو سرحدی قلعوں کو ضرور فتح کر لے۔ ایک بلغراد کا قلعہ اور دوسرا ازابہ کرز کا قلعہ۔ اِن قلعوں کی فتح سرحد کو مضبوط بنانے کے لئے بھی ضروری تھی اور یورپ میں فتوحات کے لئے بھی۔ چنانچہ سلیمان نے ہنگری کے بادشاہ لوئی ثانی کے پاس اپنے سفیر بھیجے، اور اس سے خراج کا مطالبہ کیا جس کی ادائیگی کا اُس نے وعدہ کر رکھا تھا۔ لوئی نے اس مطالبہ کا تو کوئی جواب نہ دیا البتہ ترکی سفیروں کو قتل کرا دیا۔ سلطان کو

جب یہ خبر ملی، تو وہ بہت گرم ہوا۔ اور فوراً ہنگری کی فتح کے لئے روانہ ہو گیا۔ ایک فوج نے زابہ کز اور آس پاس کے دوسرے قلعوں کا محاصرہ کر کے ان پر قبضہ کر لیا۔ سلیمان نے بلغراد کو گھیر لیا۔ سات روز کی گولہ باری کے بعد بلغراد فتح ہو گیا۔ یہ وہی بلغراد ہے جس کی فتح میں سلطان محمد فاتح قسطنطنیہ میں ناکام رہا تھا۔ سلیمان کی رحمدلی دیکھیئے کہ فتح کے بعد نہ تو اُس نے قلعہ کی فوج کو قتل کیا اور نہ شہر کے کسی باشندے کو موت کے گھاٹ اُتارا۔ ہاں اُس نے وہاں کے سب سے بڑے گرجے میں نماز ادا کی اور وہاں تین خداؤں کی بجائے ایک خدا کی عبادت ہونے لگی۔ بلغراد میں اُس نے ایک ترکی دستہ متعین کیا اور قلعہ کو مضبوط کر کے قسطنطنیہ واپس ہوا۔ اب ہنگری میں داخل ہونے کے تمام دروازے کھُل گئے تھے۔ وہ چاہتا تو ہنگری کے پایہ تخت کی طرف بڑھ سکتا تھا۔ لیکن اس سے پہلے جزیرہ روڈس کی فتح ضروری تھی۔

جزیرہ روڈس پر عیسائیوں کی حکومت تھی؛ اور ان کے جہاز بحیرۂ روم اور اناطولیہ کے ساحلوں پر لُوٹ مار مچاتے رہتے تھے۔ چنانچہ سلطان نے تین سو جہازوں کا بیڑہ قسطنطنیہ سے روڈس کی جانب روانہ کیا، اور خود ایک لاکھ فوج لے کر ایشیائے کوچک کے مغربی ساحل سے بڑھتا ہوا روڈس کے ساحل پر اُترا۔ تقریباً پانچ مہینے کی مدافعت کے بعد عیسائیوں نے ہتھیار

ڈال دیئے۔ جب ادھر سے اطمینان ہوا، تو سلیمان نے ہنگری پر حملہ کی تیاریاں شروع کر دیں، اور تھوڑے عرصہ کے بعد ایک لاکھ فوج اور تین سو توپوں کے ساتھ ادھر کا رُخ کیا۔ قسطنطنیہ سے روانہ ہونے کے پانچ مہینے کے بعد ۲۸ر اگست ۱۵۲۶ء کو موہاکز کے میدان میں ہنگری کی فوج سے مقابلہ ہوا۔ یہ جنگ دو گھنٹے سے بھی کم جاری رہی اور ہنگری کو بھاری شکست اُٹھانا پڑی۔ چوبیس ہزار ہنگری سپاہی اور بہت سے امیر مارے گئے اور لوئی بھاگتا ہوا دریا میں ڈوب کر مر گیا۔ سلیمان ہنگری کے پایہ تخت بوڈا کے سامنے پہنچا، تو شہریوں نے ہتھیار ڈال کر دروازے کھول دیئے ہنگری کے امیروں، وزیروں نے سُلطان کی خدمت میں حاضر ہو کر اطاعت قبول کر لی۔ چونکہ وہاں کے بادشاہ لوئی کی کوئی اولاد نہ تھی، اس لئے بڑے بڑے امیروں کے مشورے سے سلیمان نے وہیں کے ایک نواب کاؤنٹ زاپولیہ کو وہاں کا بادشاہ بنا دیا۔ اور ہنگری کے بعض سرحدی قلعوں میں ترکی فوج رکھ کر قسطنطنیہ واپس آ گیا۔

سلیمان کے جانے کے بعد آسٹریا کے شہنشاہ چارلس پنجم کے بھائی فرڈی ننڈ نے ہنگری کے تخت کا دعویٰ کر دیا۔ اس نے آسٹریا کی فوجوں کی مدد سے زاپولیہ کو شکست دے کر ملک سے نکال دیا۔ زاپولیہ نے سلطان سے امداد کی درخواست کی۔ چنانچہ سلیمان پھر قسطنطنیہ سے روانہ ہوا اور ڈھائی لاکھ

فوج اور تین سو توپوں کے ساتھ ہنگری میں داخل ہو کر بوڈا کا محاصرہ کر لیا چھ روز میں شہر فتح ہو گیا۔ زاپولیہ کو دوبارہ تخت پر بٹھا دیا گیا، اور سلیمان آسٹریا کے پایہ تخت ویانا کی طرف بڑھا۔ وہاں بادشاہ چارلس پنجم اس وقت یورپ کا سب سے طاقتور فرماں روا تھا۔ اس نے ویانا کی حفاظت کے لئے ایک بڑی فوج جمع کر لی اور ضروری انتظامات کی طرف متوجہ ہوا۔ اور تھوڑے ہی عرصہ میں ان کو مکمل کر لیا۔ سلطان سلیمان نے ویانا پہنچ کر شہر کا محاصرہ کر لیا۔ بارش کی کثرت کی وجہ سے سڑکیں اس قدر خراب ہو گئی تھیں، کہ ترکوں کو اپنی بڑی بڑی توپیں ہنگری میں چھوڑ دینی پڑیں۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ سرنگیں کھود کر دیواریں گرائی جائیں۔ اگرچہ کئی جگہ سے دیواروں میں شگاف پیدا ہو گئے مگر ترکی فوجیں شہر میں داخل نہ ہو سکیں۔ اتنے میں موسم بڑا سخت خراب ہو گیا۔ ترک سپاہی اس کے عادی نہ تھے۔ سلیمان نے محاصرہ اٹھا لیا۔ تین سال کے بعد اُس نے پھر ویانا کا رُخ کیا۔ شہنشاہ چارلس بھی اپنی فوج لئے ہوئے موجود تھا۔ مگر راستہ میں ایک دو قلعوں کو فتح کرنے میں کافی عرصہ لگ گیا، اور سلیمان نے ویانا کی طرف بڑھنے کا ارادہ چھوڑ دیا۔ اس کی بجائے اَور کئی شہروں کو فتح کرتا ہوا قسطنطنیہ کو لوٹ گیا۔

چند سال تک اَور زاپولیہ اور فرڈی ننڈ میں لڑائی کا سلسلہ جاری رہا آخر میں ان دونوں کے درمیان صُلح ہو گئی۔ اس کی رُو سے ہنگری کے دو حصّے

کر دیئے گئے۔ مشرقی حصے کا بادشاہ زاپولیہ کو تسلیم کیا گیا، اور مغربی حصے کا فرڈی ننڈ کو۔ دوسرے ہی سال زاپولیہ کا انتقال ہو گیا اور اس کی بیوہ اور فرڈی ننڈ کے درمیان پھر جنگ چھڑ گئی۔ زاپولیہ کی بیوہ نے اپنے بچے کے لئے سلیمان سے مدد کی درخواست کی۔ سلیمان تیسری مرتبہ ہنگری میں داخل ہوا۔ اور فرڈی ننڈ کو شکست دے کر بوڈا اور دوسرے بڑے بڑے شہروں پر قبضہ کر لیا۔ ہنگری کو اس نے کئی صوبوں میں تقسیم کر دیا، اور ان میں ترکی فوجیں اور ترکی گورنر مقرر کر دیئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شہنشاہِ چارلس اور فرڈی ننڈ نے صلح کی درخواست کی۔ اس میں جمہوریہ وینس، پوپ اور شاہِ فرانس بھی شریک ہو گئے۔ چنانچہ پانچ سال کے لئے صلح ہو گئی۔ سارے ہنگری پر سلطان سلیمان کا قبضہ تسلیم کر لیا گیا۔ یہ صلح نامہ اس بات کا ثبوت ہے کہ یورپ کی طاقتوں نے سلیمان کو شہنشاہِ اعظم تسلیم کر لیا تھا۔

جس طرح بڑی قوت کے لحاظ سے ایشیا اور یورپ کی کوئی سلطنت ترکی کا مقابلہ نہ کر سکتی تھی، اس طرح بحری طاقت کے اعتبار سے بھی اس کی برابری کوئی نہ کر سکتا تھا۔ اگرچہ اس وقت اسپین اور وینس کے بحری بیڑے سارے یورپ میں مشہور تھے۔ لیکن ترکی بیڑے نے انہیں کئی بار شکستیں دیں۔ سلیمان کے عہد میں خیر الدین پاشا ترکی کے بیڑے کا امیر البحر تھا۔ یہ بیڑہ غیر معمولی قابلیت کا مالک تھا۔ بحیرہ روم میں کوئی غیر ملکی جہاز

آنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ خیرالدین نے کئی جزیروں کو فتح کر کے سلطنت عثمانیہ میں شامل کر لیا تھا۔ اس نے بحیرۂ روم، بحیرۂ احمر اور بحیرۂ ہند میں ترکی کی بحری قوت کو درجۂ کمال تک پہنچا دیا تھا۔ یورپ کا سب سے طاقتور شہنشاہ چارلس پنجم بھی تنہا اس کے مقابلے کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔ خیرالدین پاشا کی وفات کے بعد طورغوت امیرالبحر مقرر ہوا۔ اس نے طرابلس پر جو اس وقت عیسائیوں کے قبضہ میں تھا حملہ کر کے فتح کر لیا۔

اس وقت مسلمانوں کو پرتگال سے بہت زیادہ نقصان پہنچ رہا تھا۔ پرتگیزوں نے ایک بڑا بیڑا تیار کر کے مشرق کے ملکوں سے تجارت شروع کر دی تھی۔ اور اس سلسلے میں وہ عرب جہازوں پر حملے کرتے رہتے تھے۔ چونکہ عربوں کی بھی ان ملکوں سے تجارت تھی، اس لئے پرتگیزی چاہتے تھے کہ اسے ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا جائے، تاکہ ساری تجارت ان کے ہاتھ آجائے۔ انہوں نے عرب، حبش، ہندوستان اور فارس کے ساحلی مقامات پر حملے کئے اور غیر مسلموں کو مجبور کیا کہ وہ مسلمانوں اور عربوں کے ہاتھ سامانِ تجارت فروخت نہ کریں۔ انہوں نے جدہ اور عدن پر بھی کئی حملے کئے اس میں کبھی کامیابی ہوئی اور کبھی ناکامی۔ انتہا یہ ہے کہ پرتگیز یہ خواب دیکھنے لگے۔ کہ جدہ پر کر کے حجاز پر حملہ کیا جائے، اور اسلام کی عمارت کی اینٹ سے اینٹ بجا دی جائے۔ ان سے یہ تو نہ ہو سکا مگر انہوں نے عدن پر قبضہ

کر لیا۔ سلطان سلیمان نے جب یہ خبریں سُنیں تو اُسے پرتگیزوں کی جرأت پر بڑا سخت غصہ آیا، اور اُس نے ایک بیڑا اُن کی سرکوبی کے لئے روانہ کیا۔ اس بیڑے نے پہلے عدن کو پرتگیزوں کے قبضہ سے چھڑایا اور پھر آگے بڑھ کر دشمن کے بیڑے کو گرفتار کر لیا۔ اس سے پرتگیزوں کی لوٹ مار کا بڑی حد تک خاتمہ ہو گیا۔ اور اگرچہ پھر بھی ان سے چھوٹی چھوٹی لڑائیاں ہوئیں مگر کوئی بڑا معاملہ پیش نہ آیا۔

اِدھر ہنگری میں فرڈی نَنڈ کے انتقال کے بعد اس کے جانشین میکسی ملن ثانی نے زاپولیہ کے لڑکے کو تخت سے اتارنے کا فیصلہ کر لیا۔ اور اس سلسلے میں اس نے کئی اہم قلعوں پر بھی قبضہ کر لیا تھا۔ سلیمان کو جب یہ معلوم ہوا، تو اس نے خود میدان میں آنے کا فیصلہ کیا۔ اس کی عمر اس وقت چھہتر سال کی ہو چکی تھی، اور کمزوری اور بیماری کے باعث وہ گھوڑے کی پیٹھ پر نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ چنانچہ وہ پالکی میں سوار ہوا اور ہنگری کا رُخ کیا۔ کئی قلعوں کو فتح کرتا ہوا، وہ ایک مشہور قلعہ زِگیٹ کے سامنے جا پہنچا۔ یہاں کے حاکم نے سیاہ جھنڈا بلند کر کے اس بات کی قسم کھائی کہ جب تک ایک سپاہی بھی زندہ رہے گا ہتھیار نہ ڈالیں گے۔ ترکوں نے اس قلعے پر تین حملے کئے۔ لیکن ہر بار انہیں ناکامی ہوئی۔ آخر اُنہوں نے قلعے کے سب سے بڑے برج کے نیچے سُرنگ کھود بارود بچھا دیا۔ اور ۵ ستمبر

۱۵۶۶ء کو صبح سویرے بارود میں آگ لگا دی۔ پھر بھی کہیں چار روز کی لگاتار
گولہ باری کے بعد ۸ ستمبر کو یہ قلعہ فتح ہوا۔ لیکن اس سے تین دن پہلے یعنی
۵ ستمبر کو سلطان سلیمان اس دُنیا سے رخصت ہو چکا تھا۔ وزیر اعظم نے
اس کے انتقال کی خبر بالکل پوشیدہ رکھی، اور اس کے نام سے تمام حکم
جاری کرتا رہا۔ اس نے اس کے لڑکے شہزادہ سلیم کے پاس یہ خبر بھیج دی تھی۔
اس درمیان میں ترکی فوجوں نے کئی شہر فتح کر لئے تھے۔ وزیر اعظم نے سلیمان
کی لاش پر مصالحہ لگا کر اسے خراب ہونے سے محفوظ کر لیا تھا، اور لاش کو پالکی
میں رکھ کر ایک مقام سے دوسرے مقام تک لے جاتا تھا۔ اس نے سپاہیوں
سے کہہ دیا تھا کہ سلطان بیماری کی وجہ سے باہر نہیں نکل سکتا۔ اس تدبیر سے
اس نے سات ہفتے تک اس کی وفات کو چھپائے رکھا۔ جب اسے معلوم ہو
گیا، کہ قسطنطنیہ میں شہزادہ سلیم تخت پر بیٹھ چکا ہے، تو اس نے تمام فوج
کو جمع کر کے اعلان کر دیا کہ سلطان سلیمان کا انتقال ہو چکا ہے۔

سلیمان کے عہد میں سلطنتِ عثمانیہ اپنی وسعت، قوت اور خوشحالی
کے لحاظ سے کمال کی حد تک پہنچ گئی تھی۔ اس کا رقبہ چالیس ہزار مربع میل
سے زیادہ تھا۔ اور اس میں یورپ، ایشیا اور افریقہ کے بہت سے مُلک
شامل تھے۔ اس نے صرف مُلکوں کو فتح کرنے ہی کی طرف توجّہ نہ دی، بلکہ
مُلک کا انتظام بھی نہایت اعلےٰ درجہ کا کیا تھا۔ اس نے رعایا کی بہبودی کے

لئے نئے نئے قانون بنائے تھے۔ اِس لئے اس کو سلیمان قانونی بھی کہا جاتا ہے۔ اس نے اپنی غیر مسلم رعایا کے لئے جو قانون وضع کئے تھے، وہ اعلیٰ روا داری اور روشن خیالی کی تابندہ مثال ہیں۔

سلیمان کی سلطنت کی وسعت کا ایک بڑا سبب فوجی قوت تھی۔ اپنے عہد میں اس نے فوجوں کی تعداد دُگنی کر دی تھی۔ اس کی ایک خاص فوج تھی جس کی تعداد بیس ہزار تھی۔ اس فوج کے سپاہی بڑے بہادر اور جری ہوتے تھے، اور اکثر فتوحات میں ان کا بڑا ہاتھ ہوتا تھا۔ مستقل تنخواہ دار فوج اڑتالیس ہزار تھی۔ باضابطہ فوج کے علاوہ جو بے ضابطہ فوج جنگ کے موقع پر جمع ہو جاتی تھی اس کا شمار دو لاکھ سے زیادہ تھا۔ اس کے علاوہ تین سو توپیں اور تین سو جہاز تھے۔ اگرچہ اس وقت یورپ کی عیسائی سلطنتوں کی فوجوں میں بہت ترقی ہو گئی تھی لیکن تُرکی فوجیں تنظیم اور ساز و سامان میں ان سے بہت آگے تھیں۔ ترکوں کے توپ خانے کا یورپ بھر میں کوئی جواب نہ تھا۔ سلیمان اپنی فوجوں کے آرام و آسائش اور اخلاق پر کڑی نگرانی رکھتا تھا۔ سُلطان خود بھی بڑا جنگ جُو اور بہادر تھا، اور ہر جنگ میں بذاتِ خود شامل ہوتا تھا۔

بہادری، شجاعت اور فوجی قابلیت کے ساتھ ساتھ سلطان کو عمارتوں کا بھی خاص شوق تھا۔ اُس نے قسطنطنیہ، بغداد، دمشق اور دوسرے شہروں

میں نہایت خوبصورت اور عالی شان عمارتیں بنوائی تھیں۔ کئی مسجدیں تعمیر
کرائیں۔ قسطنطنیہ میں ایک بہت بڑی نہر بنوائی اور مکہ معظمہ کی پرانی نہروں
کی مرمت کرائی۔ ان کے علاوہ سلطنت کے تمام بڑے بڑے شہروں میں ہسپتال
اور پل تعمیر کرائے۔

سلیمان علم و فضل کا بھی بڑا قدردان تھا۔ وہ خود بھی اچھا ادیب اور
شاعر تھا۔ اس کا روزنامچہ جو وہ ہر جنگ کے دوران میں لکھا کرتا تھا، بڑی
اہمیت رکھتا ہے۔ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اسے اپنے فرض کا کتنا احساس
تھا، اور سلطنت کے تمام ملکی اور فوجی معاملات پر اس کی کتنی توجہ تھی۔ سلیمان
نے بہت سے مدرسے اور کالج بنوائے، اور عالموں کے منصب میں بڑا اضافہ
کیا۔ اس نے ان کے لئے یہ قانون بنا دیا کہ ان کی جائداد کسی صورت
میں بھی ضبط نہ کی جائے گی۔ غرض سلطان سلیمان اعظم ہر لحاظ سے ترکوں کا
سب سے بڑا شہنشاہ تھا۔

خیر الدّین باربروسہ

(امیر البحر)

خیرالدّین باربروسہ

یونان کے آس پاس بہت سے چھوٹے چھوٹے جزیرے ہیں، جن پر کبھی ترکوں کی حکومت تھی۔ انہی جزیروں میں سے ایک جزیرے کا گورنر یعقوب نامی ایک شخص تھا۔ اس کے چار بیٹے تھے۔ اسحاق، الیاس، عروج اور خضر جو بعد کو خیرالدین مشہور ہوا۔ اسحاق نے تجارت کا پیشہ اختیار کیا۔ اور بہت دولت کمائی۔ باقی تینوں بھائی بہت بری اور دلیر تھے۔ انہوں نے بحری مشاغل پسند کئے۔ اور اس زمانے کے دستور کے مطابق اکا دکا اور کمزور جہازوں پر حملے کرکے انہیں لوٹنے لگے۔ اگرچہ تھوڑے عرصہ کے بعد الیاس ایک جنگ میں مارا گیا مگر عروج اور خیرالدین نے اپنا مشغلہ جاری رکھا۔ عروج چونکہ خیرالدین سے بڑا تھا، اس لئے اس چھوٹے سے بیڑے کا جو تینوں بھائیوں نے تیار کیا تھا، مالک اور سردار تھا۔

رفتہ رفتہ اس نے بہت ترقی کر لی۔ اب یونانی جزیرے اس کی ترکتازی کے لئے کافی نہ تھے۔ اس لئے اسے اپنے حوصلوں اور خواہشوں کو پورا کرنے کے لئے ایک وسیع میدان کی ضرورت پڑی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اسپین میں مسلمانوں کی حکومت ختم ہو گئی تھی اور ہزاروں مسلمان وہ ملک چھوڑ کر افریقہ کے ساحل پر آ رہے تھے تاکہ وہیں مستقل رہائش اختیار کر لیں۔ ان بے کس مسلمانوں کے پیچھے عیسائی بحری ڈاکو پڑ جاتے تھے، اور ان کو لوٹ کر مار ڈالتے تھے۔ عروج کو اپنے لئے ایک وسیع میدان کی ضرورت تھی۔ اُس نے اس موقع کو غنیمت جانا اور اپنا چھوٹا سا بیڑا افریقہ کے ساحل پر لے آیا۔ یہاں اتفاق سے اسے ایک چھوٹی سی مگر مستحکم بندرگاہ حلق الوید مل گئی۔ جس میں ایک چھوٹا سا قلعہ بھی تھا۔ عروج نے اس بندرگاہ کو اپنا مرکز بنایا۔ یہیں سے وہ اُن عیسائی لٹیروں کا خاتمہ کرتا تھا، جو اسپین کے مسلمانوں کو لوٹنے کے لئے ان کا پیچھا کرتے تھے۔

جب عروج نے اپنی قوت اور بڑھا لی، تو اُس نے ٹیونس کے سلطان سے درخواست کی کہ اسے شاہی ملازموں میں شامل کر لیا جائے۔ چنانچہ سلطان نے ٹیونس کی تمام بندرگاہیں اس کے لئے کھول دیں، اور ان کی حفاظت کا ذمہ دار اُس کو ٹھہرایا۔ عروج نے وعدہ کیا کہ وہ مالِ غنیمت کا پانچواں حصہ شاہی خزانہ میں داخل کر دیا کرے گا۔ اس کا فیصلہ ہوتے ہی

روج نے بحری بیڑے اور بندرگاہوں کی تنظیم شروع کی، اور تھوڑے ہی
عرصہ میں اس بیڑے کو بہت طاقتور بنا دیا۔ اس کے بعد اس نے وہ کارنامے
سرانجام دیئے جنہیں دیکھ کر یورپ اور عیسائیوں کے دل دہل گئے۔ سب سے پہلے
اس نے یورپ کے عیسائی بیڑے کو زبردست نقصان پہنچایا۔ پھر اس نے تمام
عیسائی دُنیا کے مذہبی پیشوا جناب پوپ کے بحری بیڑے پر حملہ کیا۔ اس بیڑے
پر آج تک کسی کو حملہ کرنے کی جرأت نہ ہوئی تھی۔ اگرچہ عروج کا بیڑا اس کے
مقابلے میں بہت کم حیثیت رکھتا تھا لیکن عروج نے کچھ ایسی بہادری اور
جنگی قابلیت کا ثبوت دیا کہ پوپ کے بیڑے کو شکست فاش ہوئی اور اس
کے تمام افسر قیدی بنا لئے گئے۔ اب عروج نے اسپین سے مقابلہ کرنے
کے لئے ایک زبردست بحری بیڑا تیار کیا۔ اس زمانے میں اسپین کی
بحری قوت کی یورپ بھر میں دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ جبرالٹر کے پاس
دونوں بیڑوں کا مقابلہ ہوا جس میں عروج کو فتح حاصل ہوئی۔

اب عروج کا نام دُور دُور تک مشہور ہو گیا۔ پھر کچھ حالات ایسے
پیش آئے کہ عروج نے افریقہ کے ایک دوسرے ملک الجزائر کو بھی فتح کر
لیا۔ اس کے بعد عروج نے اور کئی بحری لڑائیاں لڑیں جن میں سے ایک
دو میں اسے شکست بھی ہوئی لیکن اس کی ناموری اور بہادری میں کوئی
فرق نہیں آیا۔ اور یورپ کی سلطنتیں اس کے بحری بیڑے سے خوف کھاتی

رہیں۔ آخر اسپان سے ایک جنگ میں لڑتے ہوئے عروج نے شہادت پائی۔
اگرچہ عروج کا کوئی بیٹا نہیں تھا مگر اس نے اپنا جانشین ایک
شخص کو چھوڑا جس پر مسلمانوں کو ہمیشہ ناز رہے گا یعنی اپنا چھوٹا بھائی خیر
باربروسہ۔ خیرالدین بھی بڑا دلیر اور بہادر تھا۔ اس نے ملکی انتظام کا سلیقہ
بھی بہت پایا تھا۔ اس سے زیادہ وہ اس قدر دانشمند اور عاقبت اندیش
تھا کہ کوئی کام بغیر سوچے سمجھے نہ کرتا تھا۔ وہ کبھی ایسی لڑائی میں
نہیں کامیابی مشتبہ ہوتی۔ ۱۵۱۹ء میں جب الجزائر کی حکومت اپنے ہاتھ
لی، تو سب سے پہلے ایک قاصد سلطان سلیم کی خدمت میں قسطنطنیہ بھیجا۔
خوب معلوم تھا کہ ترکی اس وقت سب سے بڑی اسلامی ریاست ہے،
اس کی خدمت کرنا گویا مسلمانوں کی خدمت کرنا ہے۔ قاصد کے ہاتھ
بھیجا گیا تھا، اس میں خیرالدین نے لکھا تھا کہ اس نے الجزائر اس غرض
فتح کیا ہے، کہ اسے ترکی سلطنت میں شامل کیا جائے۔ اس لئے وہ
کی حمایت اور مدد کا ہر طرح مستحق ہے۔ سلطان سلیم نے اس کے جواب
خوشنودی کا اظہار کیا، اور خیرالدین کو الجزائر کا گورنر مقرر کر کے معمولی نشانات
گورنری یعنی مہر، تلوار، اسپ وغیرہ عطا فرمائے، اور دو ہزار بہادروں
ایک چھوٹی سی فوج بھی اس کی مدد کے لئے بھیج دی۔

جب خیرالدین حکومت کی بنیاد مستحکم کر چکا، تو وہ اپنے پرانے

ن کی طرف متوجہ ہوا۔ یہ خبر سن کر اسپین نے خود پیش قدمی کی، اور ایک بڑا
ارو بیڑا جس میں پچاس جنگی، دس شاہی اور بے شمار بار برداری کے
تھے روانہ کئے۔ مگر خیر الدین کی شجاعت اور جنگی قابلیت کے سامنے کوئی
سا نہ گئی اور یہ سارا بیڑا سمندر میں غرق ہو گیا۔

یہ عظیم الشان فتح گویا تمام کامیابیوں کی کنجی تھی۔ اس کے بعد خیر الدین
ستارہ بلند سے بلند تر ہوتا گیا۔ سال میں دو دفعہ وہ اپنے اٹھارہ جہازوں
کے خاص بیڑے کو لے کر اسپین کے ساحل پر حملہ کرتا اور مسلمانوں کو چھڑا
لاتا۔ بڑے بڑے نامی دلیر اس کی بہادری کا شہرہ سن کر ہر طرف سے
اس کے ارد گرد جمع ہو گئے تھے۔ یہ لوگ اکثر علیحدہ علیحدہ اور کبھی آپس میں
مل کر بحر روم کا چکر لگاتے تھے اور مسلمانوں کے ہر دشمن کو نیچا دکھاتے
تھے۔ کوئی چیز ان کے حملہ سے محفوظ نہ تھی۔ نہ تو تاجروں کے جہاز مقابلہ کی
طاقت رکھتے تھے اور نہ اسپین کے جنگی بیڑے۔ اس وقت شاہ چارلس یورپ
بھر سب سے بڑا بادشاہ تھا۔ مگر اس کا بیڑا بھی جب بحر روم میں آنے کی جرأت
کرتا تو پھونک پھونک کر قدم رکھتا تھا۔ حالت یہ ہو گئی تھی کہ جہاز لرزتے
تھے، بادبان تھرتھراتے تھے، مستول کانپتے تھے۔ اور کپتانوں کو دھڑکا لگا
رہتا تھا کہ "اب خیر الدین کا بیڑا آیا، اب خیر الدین کا بیڑا آیا"۔ یورپ یا افریقہ
کا کوئی بہادر اس کی ہمسری کا دم نہ بھر سکتا تھا۔ جس کام پر وہ ہاتھ ڈالتا تھا

کامیابی اس کے قدم چومتی تھی۔ وہ جس طرف قدم بڑھاتا تھا، فتح ونصرت اس
استقبال کرتی تھی۔ اس کا خاص بیڑا بھی دن بدن ترقی کر رہا تھا، اور اب اس
میں چھیاسٹھ جنگی جہاز شامل تھے۔ الجزائر میں بھی خوش حالی اور فارغ البالی
دَور دَورہ ہو گیا تھا۔ یہاں کی بندرگاہیں، گودام، کارخانے وغیرہ ہر وقت پُررو
دکھائی دیتے تھے۔

انہی دنوں سلطان سلیم کی وفات کے بعد سلطان سلیمان اعظم ترکی
تخت پر بیٹھ چکا تھا۔ وہ اس وقت عیسائی ریاستوں اور ملکوں کی سرکو
میں مشغول تھا۔ اسے بحری بیڑے کے لئے کسی تجربہ کار شخص کی ضرورت
ایک تو کئی چھوٹے چھوٹے جزیرے بحری فوج کی مدد کے بغیر فتح نہ ہو
تھے۔ دوسرے یورپ کا مشہور امیر البحر جنرل ڈوریا قسطنطنیہ کے مضا
میں اکثر حملے کرتا رہتا تھا۔ سلیمان کی نظر انتخاب خیر الدین پر پڑی
۱۵۳۵ء میں اس کی خدمات الجزائر سے قسطنطنیہ میں منتقل ہو گئیں۔ اور سلی
نے خیر الدین کو ترکی کا امیر البحر مقرر کر دیا۔

خیر الدین الجزائر سے روانہ ہوا، اور راستے میں اپنے دشمنوں کو
دکھاتا سالونیکا میں لنگر انداز ہوا۔ اور اپنے آنے کی باقاعدہ اطلاع قسطنط
بھیج دی۔ سلطان کی طرف سے ایک وفد استقبال کے لئے بھیجا گیا عسکر
سرائے کا دیوانِ خاص و عام بڑی شان وشوکت سے سجایا گیا۔ وہاں

امیر و وزیر جمع ہوئے۔ خود سلطان سلیمان ایک دریچے میں بیٹھا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اتنے میں خیر الدین کا بیڑا آتا ہوا دکھائی دیا، اور چند منٹ میں شاہی اسٹیشن میں پہنچ گیا۔ عسکری سرائے میں اس روز دلچسپ نظارہ تھا خیر الدین اپنے اٹھارہ کپتانوں کے ساتھ سلطان کے سامنے دست بستہ کھڑا تھا حاضرین اس کو بڑی حیرت کی نظر سے دیکھ رہے تھے۔ اُس کو، جس کی ہمت اور دلیری نے یورپ کے سر جُھکا دیئے تھے۔ سلطان نے بھرے دربار میں خیر الدین کو ترکی امیر البحر کا خطاب دے کر شعبۂ بحری کا نگرانِ اعلےٰ مقرر کر دیا۔

خیر الدین بغیر وقت ضائع کئے اِس شعبہ کی اصلاح میں مصروف ہو گیا۔ وہ صرف امیر البحر ہی نہیں تھا بلکہ جہاز کے تمام پیچ پرزوں سے پُوری طرح واقفیت رکھتا تھا۔ اور اعلےٰ درجہ کا جہاز ساز بھی تھا۔ اس نے پہلی نظر میں وہ خرابیاں دریافت کر لیں، جو اکثر تُرکی بیڑوں کی ناکامی کا باعث ہوتی تھیں۔ مثلاً جہازوں کے بادبان جلدی جلدی حرکت نہیں کر سکتے تھے اور جہاز بھی سبک رفتار نہیں تھے۔ اس کے علاوہ جہاز کے کپتان اور کام کرنے والے ایسے لوگ ہوتے تھے جنہیں جہاز کے پوشیدہ کل پُرزوں سے ذرا بھی واقفیت نہیں تھی۔ خیر الدین نے اپنی خاص نگرانی میں ایک نیا کارخانہ کھولا۔ اس میں نہ صرف نئے جہاز بنے جاتے تھے بلکہ

کاریگروں کو جہازرانی کی تعلیم و تربیت بھی دی جاتی تھی۔ خیرالدین بھی اکثر خود کاریگروں میں شریک ہو کر کام کرتا تھا۔ ایک سال میں اس نے اکسٹھ جنگی جہاز تیار کر لئے۔ اس طرح اٹھارہ اپنے اور پانچ اور ملا کر چوراسی جہازوں کا ایک بیڑا بن گیا ؛

اس وقت شہنشاہ چارلس کے امیرالبحر ڈوریا نے بحرِ روم میں ہلچل ڈال رکھی تھی۔ خیرالدین سب سے پہلے ڈوریا کے بحری بیڑے کی طرف متوجہ ہوا۔ مگر ڈوریا ایک محفوظ مقام میں کھسک گیا۔ خیرالدین نے کئی ساحلی شہروں پر قبضہ کر لیا۔ اور امیرالبحر ڈوریا کو مقابلے کی ہمت نہ ہوئی؛ اس کے بعد سلطان سلیمان نے اسے حکم دیا کہ وہ شمالی افریقہ کی مشہور بندرگاہ ٹیونس پر قبضہ کر کے اسے الجزائر میں شامل کر لے۔ خیرالدین نے اس حکم کی تعمیل کی۔ مگر ٹیونس کے سلطان حسن نے شہنشاہ چارلس سے جو مسلمانوں کا سخت دشمن تھا، امداد کی درخواست کی۔ چارلس فوراً پانچ سو جہازوں کا بیڑا اور تیس ہزار فوج لے کر ٹیونس پر حملہ آور ہوا۔ اتنے بڑے لشکر سے مقابلہ اگرچہ آسان نہیں تھا۔ مگر خیرالدین سے جو کچھ ہو سکتا تھا، اس نے کیا۔ اور شاید اسے کامیابی ہوتی مگر شہر والوں نے دغا کی اور آخر میں اسے ٹیونس چھوڑنا پڑا۔ شہنشاہ چارلس بڑی شان و شوکت سے شہر میں داخل ہوا۔ اور اس کی فوج نے

ں کے مسلمانوں پر سخت ظلم ڈھائے ۔

اس کے تھوڑے عرصہ بعد ترکی اور فرانس میں ایک معاہدہ ہوا
ں کی ایک شرط یہ تھی کہ کسی بیرونی حملہ کے وقت دونوں ملک ایک
سرے کی مدد کریں گے ۔ اب اتفاق دیکھئے کہ یہ معاہدہ ہوئے زیادہ
ت نہیں گزری تھی کہ فرانس اور شہنشاہ چارلس کے درمیان جنگ
روع ہوگئی ۔ معاہدہ کی شرط کے مطابق سلیمان نے فرانس کی مدد کی
خیر الدین کی سرکردگی میں ایک بیڑا چارلس کے خلاف بھیجا ۔
اُس نے سب سے پہلے جزیرہ کارفو پر قبضہ کیا ۔ اور اس کے بعد
کئی جزیروں کو جو جمہوریہ وینس کے ماتحت تھے ، فتح کر کے سلطنت
کی میں شامل کر لئے ۔

ان کامیابیوں کو دیکھ کر چارلس نے ہنگری کے بادشاہ اور
ہوریہ وینس کو اپنے ساتھ ملا کر ترکوں کے خلاف ایکا کر لیا ، اور
یہ زبردست بحری بیڑہ تیار کیا ۔ جس کی کمان امیر البحر ڈوریا کے
سپرد کی ۔ اور اس سے کہا کہ وہ ترکی کی بحری طاقت کو ہمیشہ کے
لئے ختم کر دے ۔ ڈوریا نے وعدہ کیا کہ وہ ایسا ضرور کرے گا ۔
ن کے بیڑے میں دو سو جنگی جہاز تھے ۔ ان جہازوں پر ساٹھ ہزار
چیدہ چیدہ سپاہی تھے ۔ اور ڈھائی ہزار توپیں ۔ کئی مشہور جرنیل بھی

ڈوریا کی مدد کو آگئے تھے +

خیرالدین کو جب اس ایکے کی خبر ملی تو اگرچہ اس کی مجموعی قوت ایک سو چالیس جہازوں سے زائد نہ تھی مگر وہ ذرا بھی ہراساں نہ وہ بڑی جرأت سے ڈوریا کے بیڑے کی طرف بڑھا۔ اور پریوز کے قریب ایک محفوظ مقام پر ٹھہر گیا۔ مخالف بیڑا بھی قریب ہی گیا۔ دونوں بیڑے کئی روز تک ایک دوسرے کے مقابلے ڈٹے رہے۔ آخر کار ایک صبح کو خیرالدین نے دشمن پر حملہ کر یہ حملہ ایسا سخت اور اچانک تھا کہ ڈوریا اور اس کے جرنیلو ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ آخر کار ایک گھمسان کی لڑائی کے بعد تر کو کامل فتح ہوئی۔ دشمن کے بیسیوں جہاز گرفتار کر لئے گئے۔ جا نقصان بھی بہت زیادہ ہوا +

یہ بہت بڑی فتح تھی جو خیرالدین کو امیرالبحر ڈوریا پر ہو اس سے نہ صرف ترکوں کا بحری اقتدار تمام جنوبی یورپ میں ہو گیا۔ بلکہ یورپ کے آئندہ مقابلہ کرنے کے حوصلے بھی پست ہو گئے۔ جب سلیمانِ اعظم کو اِس فتح کی خبر پہنچی، تو وہ بے انتہا خوش اس خوشی میں سارے شہر میں روشنی کی گئی خیرالدین کو خطاب اور خلعت ملے۔ اور اس کی سالانہ تنخواہ میں بھی اضافہ ہوا +

اس شکست کے بعد چارلس نے کوشش کی، کہ الجزائر پر قبضہ کرلے۔ اُس نے ایک بیڑا اس مقصد کے لئے روانہ کیا مگر اسے ناکامی کا مُنہ دیکھنا پڑا ۔

اگلے سال فرانس اور چارلس میں پھر جنگ چھڑ گئی۔ فرانس نے تُرکی بیڑے کی مدد سے شہر نیس پر قبضہ کر لیا۔ اس مدد کے بدلے میں فرانس نے تولون کی بندرگاہ ترکوں کے حوالے کر دی۔ ایک عرصہ تک ترکی بیڑا تولون میں مقیم رہا، اور جب پوری کامیابی کے بعد قسطنطنیہ واپس ہوا۔ تو حکومتِ فرانس نے سپاہیوں کی تنخواہ، کافی سامانِ سفر، بیش بہا تحفے اور جنگ کے اخراجات ادا کئے۔ اور اس کے علاوہ چار سو مسلمان غلام جو فرانسیسی جہازوں پر خلاصی تھے آزاد کر دیئے ۔

اب مشرق سے مغرب تک ترکی بیڑے کا راج تھا۔ بحرِ روم کے سب جزیرے ترکوں کے قبضہ میں آچکے تھے۔ یورپ کی ساری سلطنتیں ترکی سلطان کے سامنے سر جھکاتی تھیں۔ اس وقت کی تمام بحری طاقتیں خیرالدین سے زک اُٹھا چکی تھیں۔ خیرالدین نے ترکی کی بحری طاقت کو انتہائی عروج تک پہنچا دیا تھا۔ یورپ کا سب سے طاقتور شہنشاہ چارلس کبھی اس کے مقابلے میں تنہا آنے سے ڈرتا تھا۔

نیس کی مہم سے فارغ ہو کر خیر الدین بحری مشاغل سے بالکل الگ ہو گیا۔ اور دو سال کے بعد جولائی ۱۵۴۶ء میں اس کا انتقال ہوا۔ اُسے بشک طاش میں دفن کیا گیا۔ اس کی قبر پر جو کتبہ لگا ہے اس میں یہ الفاظ کندہ ہیں: "ماتَ امیرُ البحر"۔

انتقال کے وقت خیر الدین کی عمر نوّے برس کے قریب تھی وہ کچھ زیادہ لمبا نہ تھا۔ مگر اس کا چہرہ بڑا پُر رعب اور وجیہہ تھا بدن مضبوط اور گٹھا ہُوا۔ ڈاڑھی اور پلکوں کے بال لمبے اور گنجان تھے۔ آنکھیں روشن اور دلیری اور اولوالعزمی کا پتہ دیتی تھیں۔ وہ بے حد بہادر تھا۔ مگر حملہ کرنے میں بڑی احتیاط سے کام لیتا تھا۔ مگر ایک دفعہ جب حملہ کر دیتا تھا تو صفوں کی صفیں درہم برہم ہو جاتی تھیں۔

حقیقت یہ ہے کہ خیر الدین اپنے زمانے کا سب سے بڑا امیر البحر تھا۔ اس میں اور بھی اچھی صفات تھیں۔ دشمنوں سے مہربانی کا سلوک کرتا تھا۔ اپنے ماتحت افسروں اور سپاہیوں کی خوشی اور آرام کا اسے ہمیشہ آرام رہتا تھا۔

وہ ترکوں کا سچے دِل سے جاں نثار اور بہی خواہ تھا۔ اس پر ترکوں کو ہمیشہ ناز رہے گا۔ سلطان سلیمان اعظم اس کی بڑی قدر

منزلت کرتا تھا۔ ہر کام میں اُس سے ضرور مشورہ لیتا تھا۔ ترک بھی
اُس کی بے حد عزت کرتے تھے۔

اُس کی وفات کے بعد ایک عرصہ تک یہ رسم رہی کہ جب
کوئی ترکی بیڑا کسی مہم پر روانہ ہوتا، تو اُس کی قبر پر فاتحہ پڑھتے اور
اُس کی یاد میں ایک توپ سلامی سر کر کے بندرگاہ سے لنگر
اُٹھاتا تھا۔

اورنگ زیب عالمگیرؒ
(فاتح جنوبی ہند)

اورنگ زیب عالمگیر

"میدانِ جنگ اور سخت خطروں میں بھی وہ نماز
قضا نہ کرتا تھا، اور وقت آتے ہی خدا کے حضور میں
اس طرح کھڑا ہو جاتا تھا کہ پھر ساری دُنیا مقابلے
میں آجاتی، تو اسے مطلق پروانہ ہوتی تھی، کہ جو خدا
سے دِل لگاتا ہے وہ غیر اللہ سے کب خوف کھاتا ہے؟"

خاندانِ مغلیہ کے بادشاہوں نے ہندوستان پر تین سو سال تک
بڑی شان و شوکت اور رعب سے حکومت کی ہے۔ اس خاندان میں بڑے
بڑے بادشاہ ہوئے ہیں۔ مگر ان میں سب سے بڑا اور پکا مسلمان بادشاہ
اورنگ زیب تھا، اور اوپر کے الفاظ اسی کے بارے میں کہے گئے ہیں۔
اس کا اصلی نام محی الدین تھا، اور اورنگ زیب لقب۔ شاہ جہاں نے

عالمگیر کا خطاب دیا تھا۔ مگر یہ عام طور پر اپنے لقب ہی سے مشہور ہے
اورنگ زیب ۴ر نومبر ۱۶۱۸ء کو مالوہ کی سرحد پر ایک چھوٹے سے
میں پیدا ہوا۔ یہ شاہ جہان کا تیسرا بیٹا تھا۔ آٹھ برس کی عمر سے اس کی
باقاعدہ تعلیم شروع ہوئی۔ بڑے بڑے عالم اس کے استاد تھے۔
فارسی اس نے بہت جلد سیکھ لی۔ آپ کو یہ سُن کر شاید تعجب ہو کہ مغل با
میں اورنگ زیب پہلا بادشاہ تھا جس نے قرآن شریف حفظ کیا۔ اُسے
فقہ اور حدیث سے بھی بڑا لگاؤ تھا۔ اس کے ساتھ ہی اُس نے گھوڑے
سواری، تیر چلانا اور فنِ جنگ میں بھی کمال حاصل کیا۔ وہ ابھی چودہ
کا تھا کہ ایک بار شاہ جہاں مست ہاتھیوں کی لڑائی دیکھ رہا تھا۔ اچا
ایک ہاتھی لڑائی سے کچھ کترایا۔ دوسرے نے پیچھا کیا۔ مگر گرد و غبار کی
اُسے اپنا دشمن ہاتھی نظر نہ آیا۔ وہ اس طرف دوڑا جس طرف اورنگ
گھوڑے پر سوار موجود تھا۔ وہ ذرا نہ گھبرایا اور اپنی جگہ ڈٹا رہا۔ جب
قریب پہنچا، تو اورنگ زیب نے تیر چلایا۔ ہاتھی غصہ سے لال پیلا ہو گیا
نے جھلا کر گھوڑے کو سُونڈ میں لپیٹ لیا۔ اورنگ زیب گھوڑے
پڑا۔ اور تلوار نکال کر ایک ایسا وار کیا، کہ ہاتھی کی سُونڈ کٹ گئی،
بھاگ نکلا۔ شاہ جہاں بہت خوش ہوا اور اورنگ زیب کو اشر
میں تلوا کر اشرفیاں خیرات کر دیں۔

سترہ برس کی عمر میں اُسے دکن کا صوبے دار مقرر کیا گیا۔ یہاں اس کی
دری کے جوہر خوب چمکے۔ اس نے کئی سرکشوں کی بغاوتوں کو دبایا، اور دکن
جہاں افراتفری پھیلی ہوئی تھی، امن وامان قائم کر دیا۔ اس کے بعد اُسے
رات کا صوبے دار بنایا گیا۔ اور یہاں سے بلخ کی مہم پر روانہ کیا گیا۔ وہاں کئی
لڑائیوں میں اُس نے سپہ سالاری اور جانبازی کے جوہر دکھائے۔ ایک مرتبہ
ن گھمسان کی جنگ میں تیروں کی بارش سے بے پروا ہو کر نمازِ ظہر ادا کی۔
کا بادشاہ یہ دیکھ کر بے اختیار پکارا: "ایسے آدمی سے لڑنا خدا سے جنگ
رنا ہے"۔ چنانچہ دونوں میں صلح ہو گئی۔ اور اورنگ زیب واپس چلا آیا۔
واپس آنے کے بعد اُسے پھر دکن کا صوبے دار بنا کر بھیجا گیا جہاں
کی حالت پھر بڑی خراب ہو گئی تھی۔ مگر تین چار سال ہی کے عرصہ میں
اس نے یہاں کی حالت بدل ڈالی۔ خشک کھیتیاں ہری ہو گئیں۔ بہت
سے بنجر علاقے سرسبز نظر آنے لگے۔ صنعت وحرفت اور تجارت میں ترقی
ہوئی۔ غرض امن وامان اور خوشحالی کا دَور دَورہ ہو گیا۔ آمدنی بڑھی، تو
فوج میں اضافہ ہوا۔ اور اسے نئے ہتھیاروں سے لیس کیا گیا۔ جب
سب کچھ درست ہو گیا، تو اُس نے ہمسایہ ریاستوں کی طرف توجہ کی۔ اس
وقت وہاں دو خود مختار ریاستیں بیجاپور اور گولکنڈہ تھیں۔ شاہ جہاں یہ
نہیں چاہتا تھا کہ ان پر خواہ مخواہ قبضہ کر لیا جائے۔ مگر ان ریاستوں کے

بادشاہ بڑے بدعہد تھے، اور اکثر مغلوں کے دشمنوں کی مدد کرتے رہ
جس زمانے کا ہم ذکر کر رہے ہیں، اس وقت گولکنڈہ کا بادشاہ عبداللہ
تھا۔ مغل بادشاہوں کی طاقت کو دیکھ کر اس نے سالانہ خراج دینا
کر رکھا تھا مگر اکثر بدعہدی کرتا تھا۔ اُس نے کئی سال سے خراج
دیا تھا۔ جب اُسے لکھا گیا کہ خراج ادا کرو، تو اُس نے کوئی پروا نہ
مجبور ہو کر اورنگ زیب گولکنڈہ کی طرف بڑھا، اور دارالخلافہ حیدرآباد
چاروں طرف سے گھیر لیا۔ گولکنڈہ کی فتح بڑی آسان تھی۔ مگر اتنے میں
آئی کہ شاہجہاں سخت بیمار ہے اور بچنے کی کوئی اُمید نہیں ؛

شاہ جہاں کے چار بیٹے تھے۔ داراشکوہ سب سے بڑا تھا، اور
کے ساتھ دارالخلافہ ہی میں رہتا تھا۔ جب بیماری کی خبر پھیلی، تو چارو
بھائیوں میں تخت و تاج کے لئے جنگ چھڑ گئی۔ اس کا سارا حال بڑا
چاہتا ہے۔ مگر یہ ثابت ہو چکا ہے کہ اس میں اورنگ زیب کا کوئی قصور
اس سلسلہ میں کئی لڑائیاں ہوئیں۔ مگر ان میں سے قصبہ سامو گڑھ کے
قریب دارا اور اورنگ زیب کے درمیان جو لڑائی لڑی گئی، وہ بہت اہم
ہوئی اور اُس نے فیصلہ کر دیا کہ تخت کا حقدار کون ہے۔ سامو گڑھ
سے پچیس میل کے قریب جنوب مشرق میں واقع ہے۔ داراشکوہ ایک لا
سپاہی جن میں ساٹھ ہزار سے زیادہ من چلے سوار تھے میدان میں لایا تھا۔

زیب کے پاس پینتیس ہزار سے زیادہ سپاہی نہ تھے۔ پہلے ہی حملہ سے
زیب کی فوجوں میں کھلبلی مچ گئی۔ مگر اورنگ زیب میدان میں ڈٹا
ں کا دِل بڑھا رہا تھا۔ اس نے اپنی بہادری اور جوانمردی سے ٹکنی
ریلا روک لیا۔ اسے خوب معلوم تھا کہ لڑائی ہر چند سپاہی لڑتے ہیں
کا فیصلہ بہت کچھ سپہ سالار کی قابلیت اور جرأت پر ہوتا ہے۔ آخر اُسے
اور دارا شکوہ بھاگ گیا۔

اس کے بعد بہت کچھ ہُوا جس کے ذکر کا یہاں موقع نہیں بس اتنا
نیے کہ تمام رکاوٹوں کو دُور کر کے ۱۶۵۹ء میں اورنگ زیب تخت پر
تاجپوشی کی رسم پر بڑی دھوم دھام سے جشن منایا گیا۔

اگرچہ اورنگ زیب کے عہد میں کئی نئے علاقے فتح ہوئے اور سلطنت
یع ہوئی مگر اس کا سب سے بڑا کارنامہ دکن کی بقیہ دونوں ریاستوں
اور مرہٹوں کو ختم کرنا ہے۔ مغل شہزادوں کی خانہ جنگی کے زمانے
ن کے بادشاہوں کو خاصی فرصت مل گئی اور انہوں نے وہی پہلے
م شروع کر دیئے تھے یعنی سازشیں اور عیش و عشرت۔ البتہ دکن کے
ور پہاڑوں کی ایک نئی قوم میدان میں آ رہی تھی۔ یعنی مرہٹے جن
ی در اوڑی: زبان آریائی اور وطن شمالی دکن سے مغربی گھاٹ کے
ک پھیلا ہُوا ہے۔ اس تمام ماراشٹریا مرہٹہ علاقہ کا بڑا حصہ بیجاپور اور

احمد نگر کی ریاستوں میں بٹا ہوا تھا۔ اس قوم کے لوگ بڑے چالاک
اور چھُپ چھُپا کر لڑنے یا یُوں کہئے کہ قزاقانہ جنگ میں بڑے ماہر تھے
کے بعض سرداروں کو بیجاپور میں جاگیریں مل گئیں۔ ان میں امیر ساہو
ممتاز تھا۔ اسے پونا اور سوپا کے پرگنے اور کرناٹک کا کچھ علاقہ ملا۔ ا
لڑکا سیواجی تھا، جس کا نام بہت مشہور ہے۔ سیواجی کو بچپن ہی میں
کی مشق کرائی گئی۔ جب ذرا بڑا ہوا تو اپنے ساتھ بہت سے لوگ ملا
اور آس پاس کے قصبوں کو لوٹنے لگا۔ جب اس کی کئی شکایتیں بیجا
بادشاہ محمد عادل شاہ تک پہنچیں، تو اس نے اُس کے باپ ساہو جی کو
کر دیا۔ سیواجی نے شاہجہاں کی خدمت میں اپنے باپ کی رہائی کی درخو
کی، اور شاہجہاں کے حکم سے دربار بیجاپور نے ساہو جی کو رہا تو کر دیا۔ مگر
برابر جاری رکھی۔ باپ کے قتل کئے جانے کے خوف سے سیواجی نے
نئی شورش نہیں اُٹھائی۔ مگر اپنی قوت برابر بڑھاتا رہا۔ اتنے میں شا
کی بیماری پر مغل شہزادوں میں خانہ جنگی شروع ہو گئی۔ اور محمد عاد
نے وفات پائی۔ اس سے شمال مغربی دکن اور بیجاپور میں ابتری پھیل
موقعہ اچھا تھا۔ سیواجی نے دُور دُور چھاپے مارے۔ کئی پرگنوں پر
لیا۔ بیجاپور کے سپہ سالار افضل خاں کو دھوکے سے مار ڈالا۔ جب باد
عادل شاہ نے فوج کشی کی تو پہاڑوں میں جا چھپا۔ اور آخر باپ کی شفا

شرط پر معافی حاصل کر لی کہ ریاست بیجاپور میں لوٹ مار نہ کرے گا۔ مگر مشکل
تھی کہ اس وقت اس کے گرد پچاس ہزار سے زیادہ لٹیرے جمع ہو گئے تھے جنہیں
کھلانے پلانے کے لئے پونا کی جاگیر کسی طرح کافی نہ تھی۔ چنانچہ وہ اورنگ آباد
کے قریب مغل علاقوں پر دست درازی کرنے لگا۔ مغل صوبے دار شائستہ خاں
نے فوج کشی کی۔ سیواجی پہاڑوں میں چھپ گیا۔ کوکن کے سب قلعے مغل
راج کے قبضہ میں آ گئے۔ شائستہ خاں نے پونا فتح کر لیا، اور خاص سیواجی
کی حویلی میں ٹھہرا۔ ایک اندھیری رات کو سیواجی چھپ کر آیا۔ اس کے ساتھ
چند خونی بھی تھے۔ انہوں نے سوتے میں شائستہ خاں پر تلوار چلائی۔ مگر وہ
جاگ اٹھا اور خونی بھاگ گئے۔ شائستہ خاں کو بڑی شرمندگی ہوئی اور اس
نے وہاں سے اپنا تبادلہ کرا لیا۔ نئے صوبے دار شہزادہ معظم نے بھی اس کا
ناطقہ بند کر دیا۔ آخر راجہ جے سنگھ کی سفارش پر سیواجی کو پھر معافی مل گئی۔
مگر مرہٹوں کو تو لوٹ مار کی عادت پڑ گئی تھی۔ دو سال کے بعد اچانک سورت
کی بندرگاہ پر حملہ کر دیا۔ اور حاجیوں کو جو مکہ شریف جانے کے لئے وہاں جمع
ہوئے تھے، لوٹ لیا۔ اورنگ زیب کو اس پر سخت غصہ آیا۔ اس نے
دلیر خاں اور جے سنگھ کو انہیں سزا دینے کے لئے بھیجا۔ انہوں نے کوکن کو
پامال کر ڈالا۔ اور ایسی ناکہ بندی کی کہ سیواجی کو چھپنے کے لئے بھی کوئی جگہ
نہ رہی۔ ایک روز وہ تنہا امان مانگنے شاہی لشکر میں آ گیا، اور اس کی اطاعت

قبول کرلی گئی۔ مگراس کا سب سے اچھا علاقہ ضبط ہُوا اور اس کی ریاست بیجاپور کی بجائے مغلوں کے ماتحت کردی گئی۔ اگلے سال جب شاہی لشکر بیجاپور پر حملہ کرنے روانہ ہُوا، تو سیواجی کا بیٹا بھی مغل سپہ سالار کے ساتھ تھا بادشاہ بہت خوش ہُوا۔ اور سالانہ جشن میں شرکت کے لئے باپ بیٹا دونوں آگرے بلائے گئے۔ وہاں اُنہیں پنج ہزاری کا منصب عطا ہُوا۔ پھر کچھ غلط فہمی کچھ بدگمانی کی وجہ سے سیواجی چھُپ کر آگرے سے بھاگ گیا اور پونا پہنچ گیا۔ اَب اُسے احساس ہو گیا تھا کہ اگر مستقل ریاست قائم کرنی ہے تو مغلوں سے صُلح کیئے بغیر کام نہیں چلے گا۔ چنانچہ اُس نے ایک بار پھر بادشاہ سے معافی مانگ لی۔ اور آئندہ کئی سال تک مغلوں کے نمونے پر اپنی حکومت منظم کرتا رہا جب ساہو نے وفات پائی تو اپنی راجگی کا دھوم دھام سے اعلان کیا۔ کرناٹک میں باپ کی جو جاگیر تھی وہ بھی زبردستی اپنے بھائی سے چھین لی۔ گولکنڈہ کے نئے بادشاہ ابوالحسن ناناشاہ نے بھی اُسے بہت سی توپیں اور روپیہ دیا، اور یہ کئی دفعہ معافی مانگنے اور توبہ کرنے والا سیواجی بیجاپور، اور گولکنڈے کی شہ پر پھر مغلوں سے سرکشی پر آمادہ ہو گیا۔

اب کی مرتبہ اُس نے سرکشی تو کی مگر کسی بڑے پیمانہ پر لڑائی مُول لینے سے کتراتا رہا۔ سرحدی علاقہ پر کئی بار لُوٹ مار کی مگر کسی نہ کسی طرح سے بچ جاتا رہا۔ اور اندرونی طور پر اپنی فوجی قوت بڑھالی، اور مرنے سے پہلے ایک نئی

مرہٹہ ریاست قائم کر گیا۔ جب وہ مرا تو سنبھاجی اس کا جانشین بنا۔ یہ ناتجربہ کار تھا، اس لئے بیجاپور کے بادشاہ کے اُکسانے پر خاندیس میں جا گھسا، اور برُہان پُور کو لوٹ لیا۔ اب اورنگ زیب نے فیصلہ کر لیا، کہ مرہٹوں کا بالکل خاتمہ کرنا ضروری ہے۔ مگر اس کے لئے لازمی امر یہ تھا کہ پہلے بیجاپور اور گولکنڈہ کی ریاستوں پر قبضہ کیا جائے۔ جن کے روپے اور شہ سے مرہٹے سب کچھ کر رہے تھے۔ چنانچہ اُس نے ایک بڑا لشکر جمع کیا اور اس کو ساتھ لے کر اورنگ آباد پہنچ گیا۔

سب سے پہلے بیجاپور کی طرف توجہ کی گئی۔ اوّل وہاں کے بادشاہ کو سیدھے راستے پر لانے کی کوشش کی گئی۔ مگر جب اس میں کامیابی نہیں ہوئی، تو مغل فوجوں نے بیجاپور کے قلعہ کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ قلعہ بہت بڑا اور مضبُوط تھا، اور اُس میں کھانے پینے کے سامان کی کمی بھی نہ تھی۔ اس کے ساتھ ہی علی عادل شاہ نے مرہٹوں کو اُکسایا اور گولکنڈہ کو مدد پر بلایا مگر اورنگ زیب کا محاصرہ سخت سے سخت تر ہوتا گیا۔ آخر بیجاپُور کو ہتھیار ڈالنے پڑے۔ وہاں کا بادشاہ مُغل امیروں میں شامل کر لیا گیا، اور اس کی ریاست سلطنت مغلیہ کا حصہ بن گئی۔

اب گولکنڈہ کی باری تھی۔ اس مہم کے لئے شہزادہ محمد اعظم کو مقرر کیا گیا۔ ابوالحسن نے مقابلہ کے لئے فوج روانہ کی۔ کئی مہینوں تک لڑائی

ہوتی رہی۔ آخر مغل فوجوں کو فتح ہوئی۔ اور شہزادہ محمد اعظم حیدر آباد میں داخل ہو گیا۔ یہاں اُس نے نرمی سے کام لیا، اور ابو الحسن سے چند شرطوں پر صلح کر کے حیدر آباد خالی کر دیا۔ ان شرطوں میں ایک شرط یہ تھی کہ ابو الحسن جو پہلے بھی خراج ادا کرتا تھا، خراج کا روپیہ بڑھا دے۔

ابو الحسن نے اپنی عادت کے مطابق خراج کا روپیہ نہ روانہ کیا اور ٹال مٹول سے کام لیتا رہا۔ آخر اورنگ زیب خود فوج لے کر وہاں پہنچا۔ ابو الحسن نے پچاس ہزار فوج مقابلے کے لئے روانہ کی اور اپنے سپہ سالار کو تاکید کی کہ جہاں تک ہو سکے مغل بادشاہ کو زندہ گرفتار کر کے لائیں۔ مگر گولکنڈہ کی فوجوں کو لڑنے کا حوصلہ ہی نہ ہوا۔ اُنہوں نے کہیں بھی جم کر مقابلہ نہیں کیا۔ مغل فوجیں حیدر آباد میں داخل ہو گئیں، اور آگے بڑھ کر گولکنڈہ کے قلعہ کو گھیر لیا۔ یہ قلعہ بہت مضبوط تھا۔ بارشوں کی زیادتی اور کھانے پینے کے سامان کی کمی کے سبب مغل فوجیں بہت پریشان تھیں۔ قلعہ کو فتح کرنے کے دو ہی طریقے تھے۔ ایک تو یہ کہ سرنگ لگا کر فصیل اُڑا دی جائے، اور دوسرا یہ کہ موقعہ پا کر کچھ سپاہی اوپر چڑھ جائیں، اور پھر ساری فوج حملہ کر کے قلعہ میں داخل ہو جائے۔ مگر بارشوں کی وجہ سے سرنگ لگانے میں ناکامی ہوئی اور قلعہ پر چڑھنے کا کوئی موقعہ ہاتھ نہ آیا۔ آخر کار اورنگ زیب کے استقلال اور بہادری کے سامنے ابو الحسن

کی فوجوں نے حوصلہ ہار دیا۔ اس کے کئی سرداروں نے مغلوں کی اطاعت قبول کر لی۔ اور ایک دن ایک سردار نے قلعہ کا دروازہ کھول دیا۔ مغل فوجوں نے اندر داخل ہو کر اس پر قبضہ کر لیا۔ ناناشاہ کے ساتھ کروڑ ہا روپے نقد اور قیمتی جواہرات مغلوں کے ہاتھ آئے۔ یہ اس خراج کی رقم سے کہیں زیادہ مالیت تھی، جس کے ادا نہ کرنے کے باعث اس پر حملہ کی آفت آئی اور آزادی کا خاتمہ ہوا۔

جب ان ریاستوں کا انتظام درست ہو گیا، تو اورنگ زیب نے مرہٹوں کی طرف توجہ کی۔ بیجاپور کے جنوبی علاقہ میں ادھونی کا مضبوط قلعہ سنبھاجی کا جنگی مرکز بن گیا تھا۔ اس سے وہ مغلیہ علاقوں پر چھاپے مارا کرتا تھا۔ فیروز جنگ کو اس طرف روانہ کیا گیا جس نے ادھونی کو آسانی سے فتح کر لیا۔ اس کے بعد اس نے مرہٹوں کی راجدھانی راج گڑھ پر پیش قدمی کی۔ اس کے ایک سردار مقرب خاں نے ایک جگہ مرہٹہ فوج کو گھیر لیا۔ یہیں اُسے خبر ملی کہ سنبھاجی قریب ہی ایک جگہ موجود ہے۔ اس نے چند سپاہی ساتھ لئے اور وہاں پہنچ کر مرہٹوں کی فوج میں گھس گیا۔ مرہٹوں کی تعداد بہت زیادہ تھی مگر تھے ڈرپوک مغل سپاہیوں کو دیکھتے ہی دوڑ کھڑے ہوئے۔ سنبھاجی ایک مندر میں جا چھپا، اور داڑھی مونچھ منڈوا کر بھیس بدل لیا۔ مگر اس پر بھی پکڑا گیا۔ جب مقرب خاں اسے

باندھ کر اپنے صدر مقام کی طرف لے چلا تو علاقے بھر کی بستیوں میں خوشیاں منائی گئیں۔ سنبھاجی کے ظلم اور بدچلنی کی وجہ سے لوگ بہت تنگ تھے۔ جس گاؤں سے وہ گزرتا، عورتیں اور مرد باہر نکل آتے، اور اس کی گرفتاری پر خدا کا شکر بجا لاتے تھے۔ جب سنبھاجی اورنگ زیب کے سامنے پہنچا تو اُس نے بڑی بدزبانی کی اور اس جرم میں قتل کیا گیا۔ اس کا بیٹا ساہو شاہی امیروں میں داخل ہوا۔ اورنگ زیب نے خاص طور سے اس کی پرورش کی اور وہ بھی عمر بھر اس احسان کرنے والے بادشاہ کو عزت سے یاد کرتا رہا۔

سنبھاجی کے بعد اس کا بھائی رام راجا گدی پر بیٹھا۔ اُس نے جنجی نامی ایک قلعہ کو اپنا فوجی مرکز بنا کر اُسے بہت مضبوط کر لیا۔ مرہٹوں کا خیال تھا کہ اسے کوئی فتح نہیں کر سکتا۔ مگر ایک مغل سردار نے اس کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ راجا رام چار سال تک اِدھر اُدھر پھرتا رہا۔ کوئی جگہ ایسی نہیں تھی جہاں وہ ٹک سکے۔ اسی حالت میں وہ فوت ہو گیا۔ اب مرہٹہ قزاقوں کے گروہ مغل علاقوں میں نہ ٹھہر سکے۔ بہت سے گھر کر قید ہوئے۔ جو بچ رہے وہ کوکن کے پہاڑی قلعوں میں جا چھپے مگر اورنگ زیب کا مقصد ابھی پورا نہیں ہوا تھا۔ وہ تو یہ چاہتا تھا کہ مرہٹے کہیں بھی چھوٹی سے چھوٹی حکومت بھی قائم نہ کر سکیں۔ مغل سردار کوکن

کی پُرپیچ وادیوں میں فوج لے جانے سے گھبراتے تھے۔ اور واقعی گھبرانے کی بات بھی تھی۔ وہاں بارش سے راستے ندی نالے بن جاتے تھے۔ ہر موڑ مرہٹوں کی کمین گاہ تھا، اور ہر چٹان ان کا قلعہ۔ آخر بادشاہ نے یہ مہم اپنے ذمہ لی۔ اس وقت اُس کی عمر ۸۰ برس سے زیادہ ہو چکی تھی۔ مگر ہمت اور جرأت میں فرق نہ آیا تھا۔ ۱۶۹۹ء میں یہ مہم شروع ہوئی۔ اس سال میں جو لڑائیاں ہوئیں، اور ان میں بادشاہ نے جس حوصلہ اور بہادری کا ثبوت دیا۔ اس کی مثال نہیں مل سکتی۔ مقابلہ صرف مرہٹوں سے نہ تھا بلکہ بارش کے طوفانوں، دشوار گزار پہاڑی راستوں، جنگلوں اور سیلابوں سے بھی لڑائی تھی۔ مکمل فتح میں پانچ سال لگے۔ اور اس عرصہ کے لئے بوڑھے بادشاہ نے یہ بھلا دیا، کہ آرام و آسائش بھی کوئی چیز ہے۔ آہستہ آہستہ کرکے ایک ایک قلعہ فتح ہوا۔ ان میں سے بہت سے تو توڑ دیئے گئے اور باقی قلعوں میں مغل فوجیں رکھی گئیں۔ مرہٹے تتر بتر ہو گئے۔ اورنگ زیب کی زندگی میں انہوں نے کوئی فتنہ نہ اُٹھایا۔ تمام مُلک میں امن و امان کی منادی کرا دی گئی کہ جو لوگ اپنے گھروں کو چھوڑ کر چلے گئے ہیں، وہ واپس آجائیں کیونکہ اب مرہٹوں کا پوری طرح خاتمہ ہو چکا ہے۔ اب چند میل زمین بھی ایسی نہ رہی تھی، جہاں مرہٹوں کی خود مختار حکومت باقی ہو۔

جب یہ عظیم الشان کام ختم ہوا تو اورنگ زیب احمد نگر آگیا۔ یہاں

ایک سال سے زیادہ ٹھہرا رہا۔ اور ۱۷۰۷ئہ میں مختصر سی بیماری کے بعد انتقال کیا۔ وفات سے چند گھنٹے پہلے جب کہ دمہ کا دورہ تھا یہ وصیت لکھی کہ تجہیز و تکفین میں سنت کے خلاف کوئی رسم ادا نہ کی جائے۔ خواجہ برہان الدین غریب کے پائیں باغ میں دفن کیا جائے، اور کوئی پکی قبر یا گنبد نہ بنایا جائے جس وقت جنازہ احمد نگر سے خلد آباد لائے، تو راستہ پر دونوں طرف لوگ کھڑے آنسوؤں کے موتی نچھاور کر رہے تھے، اور ہزارہا امیر وزیر اور سپاہی روتے ہوئے ساتھ تھے۔ اس کی قبر کی زیارت کرنے جائیے تو دل پر عجیب اثر ہوتا ہے۔

اورنگ زیب کی بہادری اور دلیری میں کسی کو کلام نہیں۔ خاندانِ مغلیہ میں بابر سے اورنگ زیب تک ہر بادشاہ بہادری اور جرأت میں ممتاز تھا اکبر کو مست ہاتھیوں سے لڑنے کا بہت شوق تھا۔ شاہجہاں نے شہزادگی کے زمانے میں تلوار سے شیر مارا تھا۔ اورنگ زیب کسی سے پیچھے نہیں تھا۔ یہ پہلے بیان ہو چکا ہے، کہ کس طرح چودہ سال کی عمر میں اس نے تلوار کے ایک وار سے مست ہاتھی کا خاتمہ کر دیا تھا۔ جب ساموگڑھ کے مقام پر اورنگ زیب اور دارا کی فوجوں میں لڑائی ہوئی، جس کا ذکر ہو چکا ہے تو اورنگ زیب کی فوج صرف تیس ہزار تھی، اور دارا کی ایک لاکھ سے زیادہ۔ لڑائی شروع ہوئی، تو اورنگ زیب کے ساتھ صرف ایک ہزار آدمی

رہ گئے۔ حالت بڑی نازک ہو گئی۔ قریب تھا کہ اُسے شکست ہو جاتی۔ مگر وہ اکیلا ڈٹ کر کھڑا تھا۔ اس نے حکم دے دیا کہ اس کے ہاتھی کی ٹانگیں زنجیروں سے باندھ دی جائیں۔ اس سے زیادہ بہادری اور بے خوفی کی مثال کہاں مل سکتی ہے۔ صرف اورنگ زیب کی بہادری ہی تھی جس نے ایک ہزار کو ایک لاکھ پر فتح دی۔ جب اسّی سال کا بوڑھا اورنگ زیب مرہٹوں کے خلاف لڑ رہا تھا، تو ایک دن مرہٹوں نے ایک سُرنگ اُڑا دی جس سے بہت سے سپاہی مارے گئے اور فوج میں گڑبڑ پھیل گئی۔ یہ سُنتے ہی وہ جھٹ گھوڑے پر سوار وہاں آیا اور سپاہیوں کو تسلّی دی۔ وہ چاہتا تھا، کہ مرہٹوں پر حملہ کرنے میں وہ سب سے آگے رہے لیکن بڑی مشکل سے اُس کو اس ارادے سے باز رکھا گیا۔ راجہ جسونت سنگھ کے مرنے کے بعد جب راجپوتوں نے بغاوت کی، تو اورنگ زیب خود راجپوتانہ پہنچا، اور اپنے بیٹے شہزادہ اکبر کو شاہی فوجوں کا سپہ سالار مقرر کیا۔ مگر راجپوتوں نے بڑی چالاکی سے اکبر کو بادشاہت کا لالچ دے کر اپنی طرف کر لیا، اور وہ ستّر ہزار سپاہی لے کر اورنگ زیب پر پلٹ پڑا۔ اورنگ زیب کے پاس صرف ایک ہزار سپاہی تھے۔ مگر وہ ذرا بھی پریشان نہ ہوا۔ اور شہزادہ اکبر کو شکست کھا کر بھاگنا پڑا۔ اورنگ زیب کے زمانے میں بارہ کے سیّد بڑے بہادر گنے جاتے

تھے۔ فوج میں بھی ان کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ ایک بار اُن کی آپس میں
لڑائی ہو گئی۔ اورنگ زیب نے حکم دیا کہ قاضی کے سامنے مقدمہ پیش ہو
سیدوں نے کہا۔ ہم اپنا فیصلہ خود کریں گے۔ اورنگ زیب یہ سُن کر برہم
برہم ہُوا، اور کہا۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ یہ کہہ کر حکم دیا کہ پہرے وغیرہ
پر جتنے سید ہیں سب برخواست کر دیئے جائیں۔ سیدوں کا سارا غرور جاتا
رہا۔ اورنگ زیب کا بیٹا شہزادہ اعظم بڑا بے خوف اور دلیر تھا۔ مگر اپنے باپ سے
اس قدر ڈرتا تھا کہ جب اُس کا خط آتا تو شہزادے کا رنگ زرد پڑ جاتا تھا۔

ہندوستان کی تاریخ میں اورنگ زیب جیسا نیک اور عبادت کرنے
والا اور کوئی بادشاہ نہیں گزرا۔ وہ بڑا پکا نمازی تھا۔ ہفتہ میں چار دن روزہ
رکھتا تھا۔ اور رمضان کی ساری راتیں عبادت میں گزار دیتا تھا۔ اس کی
اپنی زندگی نہایت سادہ تھی۔ وہ خزانہ سے اپنے خرچ کے لئے کچھ نہیں لیتا
تھا۔ وہ اپنا گزارہ ٹوپیاں سی کر اور قرآن شریف لکھ کر کرتا تھا۔

اورنگ زیب کو ظلم اور بے انصافی سے بڑی نفرت تھی۔ اُس کی
ہمیشہ یہ کوشش رہتی تھی۔ کہ کسی پر ظلم نہ ہونے پائے۔ فریادیوں کے لئے
اس کے دروازے ہر وقت کھلے رہتے تھے۔ وہ ان کی درخواستیں پڑھتا اور
مقدموں کا فیصلہ کرنے میں امیر، غریب، آقا اور غلام کی ذرا بھی تمیز نہ کرتا۔
اس کے سامنے کسی کی سفارش نہیں چلتی تھی۔ اس کے انصاف کے لئے شاہ

نالے مشہور ہیں ؛

اُسے کبھی غصہ اور طیش نہیں آتا تھا۔ اکثر نرمی سے کام لیتا تھا مگر
عند ضرورت کسے وقت سختی بھی کرتا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ بادشاہ کو نرمی
ر سختی کے درمیان کھڑا ہونا چاہیئے۔ نہ زیادہ نرمی کرنی چاہیئے نہ زیادہ سختی
ر زیادہ نرمی ہوگی، تو لوگ بے پروا ہو جائیں گے، اور زیادہ سختی ہوگی، تو
نہیں بادشاہ سے نفرت ہو جائے گی، اور یہ دونوں باتیں بُری ہیں۔ وہ اپنے
فسروں سے بہت اچھا سلوک کرتا تھا، اور ہمدرد بھی بہت تھا۔ وہ اپنی
عایا سے چاہے وہ ہندو ہوں یا مسلمان برابر کا سلوک کرتا تھا۔ اُس کے
ہد میں ہر ایک کو مذہبی آزادی حاصل تھی۔ وہ جس طرح مسجدوں کی حفاظت
کرتا تھا اسی طرح مندروں کی بھی کرتا تھا۔ اس کے زمانے کے کئی فرمان ملے
یں جن سے پتہ چلتا ہے، کہ اُسے اپنی ہندو رعایا کا کس قدر خیال تھا۔ اُس
نے کئی مندروں کے خرچ کے لئے جاگیریں بھی وقف کردی تھیں۔ اس
کے متعلق یہ جو کہا جاتا ہے کہ اُس نے مندر برباد کر دیئے تھے بالکل غلط ہے

اورنگ زیب نے جنگوں اور فتوحات کے ساتھ مُلکی انتظام بھی درست
کیا۔ ہر محکمہ میں ایک نئی رُوح پھونک دی۔ چھوٹے سے لے کر بڑے تک
ہر عہدہ دار اور افسر اپنی جگہ چوکس اور اپنے فرض کی ادائیگی میں لگ گیا۔ صوبوں
کے ہر بڑے شہر اور قلعوں سے باقاعدہ ہفتہ وار اُسے اطلاعات پہنچتی تھیں

انہیں وہ خود پڑھتا اور مناسب احکام دیتا تھا۔ معمولی سے معمولی شکایت کو فوراً دُور کر دیتا تھا۔ ایک دفعہ ایک معمولی چوکیدار اور کاشتکار کی تکلیف کی خبر فوراً اُسے دُور کیا گیا۔ محکمہ مالگزاری کی طرف خاصی توجہ دی گئی۔ بددیانت افسروں کو برطرف کر دیا گیا۔ ان میں سے جن افسروں نے معافیاں مانگیں اور آئندہ سے کام کرنے کی قسمیں کھائیں انہیں بحال کر دیا گیا۔ اس توجہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ مالگزاری پہلے سے بڑھ کر تقریباً دوگنی ہو گئی۔

جشن تاجپوشی کے موقعہ پر کئی رسمیں شرع کے خلاف ہوتی تھیں۔ نے ان سب کو موقوف کر دیا۔ مسلمانوں کے اخلاق کی نگرانی کے لئے ایک محکمہ قائم کیا اور زکوٰۃ کی وصولی کا باقاعدہ انتظام کیا گیا۔ جن سیّاحوں نے اس زمانہ میں ہندوستان کا سفر کیا ہے، وہ سب لکھتے ہیں کہ ملک میں ہر طرف خوش حالی کا دُور دَورہ تھا۔ لوگ خوش تھے۔ چیزیں نہایت ارزاں تھیں اور تجارت خوب زوروں پر تھی۔

غرض مدّتِ بادشاہی اور سلطنت کی وسعت دونوں اعتبار سے اورنگ زیب تاریخ ہند و پاکستان کا سب سے بڑا بادشاہ گزرا ہے۔ اُس نے پچاس سال سے زیادہ حکومت کی۔ کابل سے آسام اور کشمیر سے کاویری تک اس کے نام کا سکہ چلا اور ہر مسجد میں خطبہ پڑھا گیا۔

ٹیپو سلطان
(شیر میسور)

ٹیپو سلطان

"گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے شیر کی ایک
دن کی زندگی اچھی ہے!"

یہ الفاظ شیرِ میسور ابوالفتح فتح علی ٹیپو سلطان نے اپنی شہادت سے کچھ عرصہ پہلے کہے تھے۔ کتنے زوردار اور سچے الفاظ ہیں یہ؟

ٹیپو سلطان کی ولادت بنگلور کے قریب ایک قصبہ میں آج سے کوئی دو سو برس پہلے ہوئی۔ والد کا نام حیدر علی تھا۔ حیدر علی ریاست میسور کی فوج میں ایک رسالدار تھا۔ دکن کی اس چھوٹی سی ریاست کا راجہ ایک ہندو تھا۔ یہ راجہ بہت کمزور تھا۔ اور اصلی حکومت اس کے وزیر کے ہاتھ میں تھی۔ وزیر کو وہاں کی زبان میں "دلوائی" کہتے تھے۔

حیدر علی بڑا ہوشیار اور ذہین شخص تھا۔ اس نے رفتہ رفتہ بڑی

قوت اور طاقت حاصل کر لی۔" دلوائی کچھ گھبرا گیا، اور اس نے ارادہ کر لیا
کہ اس رسالدار کو ختم کر دیا جائے۔ حیدر علی بھی سمجھ گیا، کہ کیا معاملہ ہے
دونوں میں اَن بن ہو گئی۔ اور آخر میں لڑائی تک نوبت آ پہنچی۔ حیدر علی
کو اس میں فتح ہوئی، اور اُس نے راجہ اور اس کے وزیر دونوں کو نظر بند
کر دیا۔ اور خود ریاست کا حاکم بن گیا۔ اُس نے رفتہ رفتہ اپنی سلطنت
کو بہت مضبوط کر لیا جس سے آس پاس حکومتیں اور ریاستیں ڈرنے لگیں
اس وقت جنوبی ہند کی عجیب حالت تھی۔ سلطان اورنگزیب عالمگیر
کے انتقال کے بعد یہاں مغلوں کا رعب اور دبدبہ ختم ہو چکا تھا۔ مرہٹوں نے
پھر سر اُٹھایا تھا، اور اپنی حکومت کو بڑھانے کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہے
تھے۔ ادھر نظام حیدر آباد بھی اپنی سلطنت کو مضبوط کرنے کی فکر میں تھا۔ ان
کے علاوہ ایک نئی قوم بھی اس صورتِ حالات سے فائدہ اُٹھانا چاہتی تھی
یہ نئی قوم انگریز تھی جنہوں نے کچھ عرصہ پہلے جنوبی ہند کے بعض علاقوں
پر قبضہ کر کے اپنی طاقت کو بہت بڑھا لیا تھا، اور وہ اس فکر میں تھے
کہ سارے مُلک پر قبضہ کر لیں۔ حیدر علی کی دُور اندیش نگاہوں نے اسی
وقت اس خطرے کو محسوس کر لیا تھا۔ وہ بڑا سمجھدار تھا، اور چاہتا تھا کہ
انگریزوں کی ہر چال کو ناکام بنا دے اور انہیں یہاں سے باہر نکال کر
پھر اسلامی سلطنت قائم کرے۔ چنانچہ اس سلسلے میں اسے انگریزوں

کئی بار لڑنا پڑا۔ اور ہمیشہ اس کا پلّہ بھاری رہا۔ جب اس کا انتقال ہُوا تو اس کی حکومت ریاست میسور کے علاوہ کئی علاقوں پر قائم ہو چکی تھی ÷

حیدر علی کی وفات کے بعد اس کا بیٹا ٹیپو سلطان تخت پر بیٹھا۔ اسے بچپن ہی سے بڑی اچھی تعلیم و تربیت دی گئی تھی۔ سپہ گری اور شہسواری سکھلانے کے لئے بڑے بڑے مشہور اُستاد رکھے گئے تھے ٹیپو سلطان نے پندرہ سولہ برس کی عمر میں اپنے آپ کو ایک لائق شہزادہ اور بہادر سپاہی ثابت کیا تھا۔ وہ باپ کے ساتھ لڑائیوں میں شامل ہونے لگا تھا اور اس طرح جنگ کے طریقوں سے عملی واقفیت حاصل کر لی تھی۔

جس وقت ٹیپو سلطان تخت پر بیٹھا، اس وقت انگریزوں سے جنگ کا خاتمہ نہ ہُوا تھا۔ اور مختلف محاذوں پر لڑائیاں برابر جاری تھیں۔ سب سے پہلے سُلطان نے اس طرف توجہ کی۔ آخر ایک معمولی سی جنگ کے بعد انگریزوں سے صلح ہو گئی ÷

مرہٹوں اور حیدر آباد کے نظام الملک نظام علی خاں کو اُمید تھی، کہ حیدر علی کے مرنے کے بعد میسور کا جسے سلطنتِ خداداد کہا جاتا تھا خاتمہ ہو جائے گا۔ مگر اُن کی اُمیدوں کے خلاف سلطنتِ خداداد کو بڑی شان و شوکت حاصل ہوئی، اور اس کا پرچم دریائے کرشنا سے لے کر

ٹراونکور تک لہرانے لگا۔ چنانچہ مرہٹوں اور نظام نے ایکا کر کے ٹیپو سلطان پر حملہ کر دیا۔ ٹیپو سلطان نے بہت چاہا کہ نظام اس جنگ میں شامل نہ ہو۔ وہ مسلمان ہے اور مسلمانوں کو آپس میں نہیں لڑنا چاہئے لیکن اس کی یہ کوشش ناکام ہوئی۔ چنانچہ مجبور ہو کر اسے بھی مقابلہ پر آنا پڑا لڑائی ہوئی اور مرہٹے اور نظام بڑی طرح شکست کھا کر میدانِ جنگ سے بھاگ گئے۔

سلطان کی طاقت سے خوف کھا کر انگریزوں نے پھر اس سے جنگ چھیڑ دی۔ اس وقت لارڈ کارنوالس یہاں کا گورنر جنرل تھا۔ اس نے مرہٹوں اور نظام کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا۔ اور بغیر کسی وجہ اور جنگ کا اعلان کئے میسور کی سلطنت میں داخل ہو کر بنگلور پر قبضہ کر لیا۔ اور سرنگا پٹم کی جانب بڑھنے لگا۔ اس سے پہلے انگریزوں نے بڑی چالاکی سے سازشوں کا ایک جال پھیلا دیا تھا۔ ٹیپو سلطان کے بہت سے امیروں اور وزیروں کو اپنے ساتھ ملا لیا تھا، اور یہ بدبخت سونے اور چاندی کی خاطر اپنے آقا سے غدّاری کر رہے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ سلطان کو انگریزوں کی نقل و حرکت کا پتہ نہ چلتا تھا، اور اس کے برخلاف انگریزوں کو سلطان کی ہر حرکت کی اطلاع ملتی رہتی تھی۔ بہر حال سلطان نے سرنگا پٹم میں بڑی بہادری اور مستقل مزاجی سے انگریزوں

مدافعت کی۔ محاصرہ نے یہاں تک طول کھینچا کہ انگریزوں کے پاس کھانے پینے کا سامان بالکل ختم ہو گیا۔ اور بارشیں بھی شروع ہو گئیں۔ اس لئے کارنوالس کو محاصرہ اُٹھانا پڑا۔ مگر برسات کے بعد کارنوالس نے پھر ایک بڑی فوج کے ساتھ سرنگا پٹم کا محاصرہ کر لیا۔ اب کے اس کی فوج کی تعداد نوّے ہزار کے قریب تھی۔ مرہٹے اور نظام بھی ان کے ساتھ تھے۔ لیکن سلطانی سپاہ چالیس ہزار سے زائد نہ تھی۔ انگریزوں نے قلعہ فتح کرنے کی بڑی سخت کوشش کی۔ لیکن سلطان کی بہادری اور جراُت کے سامنے ایک نہ چلی۔ مگر انگریزوں نے محاصرہ ضرور جاری رکھا آخر مجبور ہو کر سلطان نے انگریزوں سے صلح کر لی۔ یہ سرنگا پٹم کا معاہدہ کہلاتا ہے۔ اس معاہدہ کی رُو سے سلطان ٹیپو کو اپنے آدھے مُلک سے دستبردار ہونا پڑا۔ اور تیس لاکھ پونڈ بطورِ تاوانِ جنگ ادا کرنا پڑے۔ اس کے علاوہ اپنے دو بیٹے یرغمال کے طور پر لارڈ کارنوالس کے حوالے کئے۔ ان حوصلہ شکن حالات کا مقابلہ کرنا اور کھوئے ہوئے اقتدار کو دوبارہ حاصل کرنا ایک مستقل مزاج اور حوصلہ مند انسان ہی کا کام تھا۔ سلطان ٹیپو نے مردانہ وار حالات کا مقابلہ کیا، اور تھوڑے ہی عرصہ میں اپنے اقتدار کو دوبارہ حاصل کر لیا۔ اس نے تھوڑی سی مُدت میں اس رقم کے ادا کرنے کا بھی بندوبست کر لیا جو تاوانِ جنگ کے سلسلہ میں اس کے ذمہ تھی۔ اس نے

ملک کے قدرتی ذرائع کی اچھی طرح جانچ پڑتال کر کے ان سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ اس نے اپنی فوجوں کی نئے سرے سے تنظیم کی۔ فوجی انتظام کے لئے علیحدہ محکمہ قائم ہوا۔ اور فوج کو نئے ہتھیاروں سے لیس کیا گیا۔ بحری فوج کی طرف خاص طور سے توجہ کی۔ چھ سات سال کی مدت میں اس کی سلطنت پھر اتنی مضبوط ہو گئی کہ مرہٹے، نظام اور انگریز تینوں خوف کھانے لگے۔

اس دوران میں لارڈ کارنوالس کی جگہ لارڈ ولزلی گورنر جنرل بن کر آگیا تھا۔ اس نے ارادہ کر لیا تھا کہ سلطنتِ میسور کو ختم کر کے دم لے گا اسے یقین تھا کہ اگر ایسا نہ کیا گیا، تو سلطان انگریزوں کو ہندوستان سے باہر نکال دے گا۔ اصل میں وہ ہندوستان میں قدم رکھنے سے پہلے ہی سلطان کے عزم و ثبات، اس کی خداداد صلاحیتوں اور تعمیری سرگرمیوں کی داستان سن چکا تھا، اور اس کے دماغ پر سلطان ٹیپو کا خوف پوری طرح مسلط ہو چکا تھا۔ وہ اس زبردست حریف کو مٹانے کے لئے طرح طرح کے منصوبے گانٹھ رہا تھا۔

اُدھر سلطان جانتا تھا کہ انگریزوں کا ہندوستان پر قابض ہونا اسلام اور مسلمانوں کے لئے بہت بڑا خطرہ ہے۔ اس نے مرہٹوں اور نظام کو اس خطرے سے آگاہ کیا اور انہیں اپنے ساتھ ملانے کی کوشش

کی۔ مگر مرہٹوں اور نظام کی حماقت اور ناعاقبت اندیشی اور دشمن کی چالوں کے سامنے اُس کی پیش نہ گئی۔ ان سے نااُمید ہو کر سُلطان نے سُلطان ترکیہ اور نپولین اعظم کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ سلطان ترکیہ نے تو خاموشی اختیار کر لی۔ مگر نپولین نے امداد کا وعدہ کیا۔ لیکن تقدیر کھڑی ہنس رہی تھی۔ چنانچہ سلطان کے تمام منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے۔ غداروں نے وہ کام کیا، جو دشمن شمشیر و سناں سے نہ کر سکتا تھا۔ سُلطان کا اپنا ماموں محمد صادق انگریزوں کے ہاتھ بِک چکا تھا۔

لارڈ ولزلی نے جیسا کہ اشارہ کیا جا چکا ہے پہلے سے بھی کہیں بڑا سازش کا جال پھیلایا۔ جنوبی ہند میں مشہور ہے کہ ایک انگریز پیرین کر ریاست کی حدود میں مقیم ہو گیا۔ یہ مصنوعی پیر سلطان کے خلاف لوگوں کو اُکساتا اور اُنہیں مالی امداد دے کر حکومت سے برگشتہ کرتا۔ اس نے اپنا جال اتنا لمبا کیا کہ سلطان کے بڑے بڑے فوجی افسر اور امرائے دربار بھی اس کے دامِ فریب میں پھنس گئے۔ اب سلطان کے اندرونی رازوں اور اس کی مہموں کے منصوبوں کا لارڈ ولزلی کو علم ہونے لگا۔ سلطان کے فوجی افسر بظاہر تو اُس کی حمایت کا دم بھرتے تھے مگر اندرونی طور پر دشمن سے ساز باز رکھتے تھے۔

آخر جب ہر قسم کی تیاریاں پوری ہو گئیں تو انگریزوں سے سرنگاپٹم

کے قلعہ پر حملہ کر دیا۔ اور غدار امیروں نے ان کی قلعہ کے اندر اور باہر راہنمائی کی۔ جب سلطان نے دیکھا کہ انگریز قلعہ پر بڑھتے آرہے ہیں تو وہ خود مقابلہ کے لئے نکلا۔ دہلی دروازہ کے قریب اس کا انگریزی فوج کے ساتھ مقابلہ ہوا۔ سلطان اور اس کے محافظ دستے نے دشمن کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روک دیا۔ یہاں نہ صرف بندوقوں سے لڑائی ہوئی۔ بلکہ تلواریں بھی استعمال ہوئیں۔ تقریباً تین گھنٹے تک سلطان نے انگریزی فوج کو آگے بڑھنے سے روکے رکھا۔ لیکن اب انگریزی فوج کے اور دستے دوسرے دروازوں کے ذریعہ شہر کے اندر داخل ہو گئے تھے۔ مجبوراً سلطان کو پیچھے ہٹنا پڑا۔ اور جب وہ شہر کے بڑے دروازے کے قریب پہنچا تو تین طرف سے گھر گیا۔ اس وقت ایک امیر نے کہا کہ حضور اپنے آپ کو انگریزوں کے حوالے کر دیں۔ سلطان نے پلٹ کر غصّے سے جواب دیا۔ "گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی بہتر ہے"۔

دروازے کے قریب ایک چھوٹی سی جگہ تھی، وہاں لڑائی ہونے لگی۔ بڑے گھمسان کا رن پڑا۔ اچانک ایک گولی سلطان کے گھوڑے کو لگی۔ گھوڑا وہیں گر گیا۔ اور سلطان پیادہ ہو کر لڑنے لگا۔ اس کے جانثار اپنے شیر دل آقا پر نثار ہونے لگے۔ انگریزوں کو جب معلوم ہوا کہ سلطان

خود یہاں لڑ رہا ہے، تو تمام انگریزی فوج اس جگہ جمع ہو گئی۔ سلطان اِس دست بدست لڑائی میں جس بہادری اور دلیری سے لڑا، اس کو دیکھ کر دشمن بھی حیران رہ گئے۔ آخر ایک گولی سُلطان کے دل کے قریب لگی، اور وہ زخمی ہو کر گر گیا۔ گویا دوپہر کے ڈیڑھ بجے سے شام کے سات بجے تک دست بدست جنگ کے بعد سلطان اور اُس کے جانثار شہید ہو گئے۔ زخمیوں اور مارے جانے والوں کی تعداد اس قدر زیادہ تھی کہ یہ معلوم بھی نہ ہو سکا سلطان کس جگہ ہے۔ بارہ ہزار بہادر اِس شمع کے گرد پروانوں کی طرح فدا ہو چکے تھے۔ یہ بھی نہیں معلوم کہ اس شہیدِ ملّت سُلطان کی روح کب اپنے جسم سے جُدا ہو کر خدا کے حضور میں پہنچی۔ مگر خیال ہے کہ مغرب کا وقت تھا۔ شہادت کے وقت سلطان کی عمر ۴۸ سال کی تھی۔

جس وقت سُلطان کی لاش ملی، اس کی آنکھیں کُھلی ہوئی تھیں جسم اس قدر گرم تھا کہ دھوکا ہوتا تھا کہ وہ ابھی زندہ ہے۔ سلطان کو گولی کے چار زخم آئے تھے، تین جسم پر اور ایک سیدھا کان میں۔ سلطان کا جنازہ نہایت احترام اور احتشام کے ساتھ ظہر کے وقت قلعہ سے روانہ ہوا۔ تمام شہزادے، امیر، وزیر ساتھ تھے۔ انگریزی فوج کے چار دستے بھی پیچھے پیچھے تھے۔ راستے میں دونوں طرف ہر مذہب ملّت کی عورتیں اور مرد کھڑے زار و قطار رو رہے تھے۔ معلوم ہوتا تھا جیسے قیامت

آگئی ہو۔ شہر کے قاضی نے نماز جنازہ پڑھائی۔ اور اس نامور سلطان کو اس کے باپ کے پہلو میں دفن کیا گیا۔

سلطان شہید کی موت درحقیقت اسلامی شان و شوکت کی موت تھی یہی وجہ ہے جب انگریزوں کو اس کی شہادت کی اطلاع ملی، تو وہ پکار اُٹھے "آج ہندوستان ہمارا ہے"۔

سلطان ٹیپو ایک بہادر سپاہی اور سپہ سالار ہی نہ تھا بلکہ ملکی انتظام میں بھی اس کو بڑی مہارت تھی اس نے اپنی سلطنت میں بڑی بڑی اصلاحیں کیں اور ہر محکمہ کی نئے سرے سے تنظیم کی۔ یہی وجہ ہے کہ تھوڑے عرصہ میں رعایا فارغ البال اور مُلک خوشحال ہو گیا۔ زراعت، تجارت، صنعت و حرفت کو ترقی ہوئی۔ سلطان نے بری اور بحری فوج کو بھی بہت طاقتور بنا دیا تھا اس نے فوجی محکمہ کے لئے اپنی نگرانی میں ایک کتاب لکھوائی تھی جس کا نام تحفۃ المجاہدین ہے۔ اس میں تمام فوجی قاعدے اور قانون درج ہیں

سُلطان میں بہت سی خوبیاں جمع ہو گئی تھیں۔ وہ نہایت نرمی اور ملائمت سے بات چیت کرتا تھا۔ اس کی زبان سے کبھی کوئی فحش کلمہ نہیں نکلا۔ اسے اس امر کا احساس تھا کہ جب تک مسلمان سادہ زندگی اختیار نہ کریں گے، وہ دُنیا میں ترقی نہیں کر سکتے۔ اس لئے اس نے تمام تکلفات کو ختم کر دیا تھا۔ اُٹھنے بیٹھنے، آداب و سلام اور تحریر و تقریر میں جو سادگی اس

نے اختیار کی، وہ آپ اپنا نمونہ ہے۔ سلطان نماز کا بڑا سخت پابند تھا، اور نمازِ صبح کے بعد تلاوت قرآن مجید ضرور کرتا تھا۔ وہ رحم دل بھی بہت تھا۔ اس کی ہزاروں مثالیں موجود ہیں۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے، کہ رات کا وقت تھا سلطان اپنے خیمے میں سو رہا تھا۔ اس کو کراہنے کی آواز آئی۔ خیمے سے نکل کر دیکھا، تو پتہ چلا، قیدی پیاس سے تڑپ رہے ہیں، سلطان نے انہیں خود پانی لا کر پلایا اور اس وقت تک نہ سویا جب تک یہ قیدی نہیں سو گئے

اس کی جنگی قابلیت کو دشمن بھی مانتے ہیں۔ فوجی معاملات میں اس کی رائے ہمیشہ ٹھیک ثابت ہوتی تھی۔ اسے آخر میں شکست ہوئی، تو اس کی وجہ محض اس کے وزیروں اور امیروں کی غداری تھی اور کچھ نہیں۔ سلطان کی بہادری اور دلیری کی اس سے زیادہ روشن مثال اور کوئی نہیں مل سکتی، کہ وہ دست بدست جنگوں میں خود شریک ہوتا، اور لڑائیوں میں سب سے آگے رہتا تھا۔ شیر کا شکار اس کی بہترین تفریح تھی؛ اور جوانی میں اس نے تن تنہا کئی شیروں کو اپنی تلوار سے مارا تھا۔ آج بھی جنوبی ہند کے لوگ اس بہادر سلطان کو "شیر میسور" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ سلطان نے کئی شیر اپنے محل میں پال رکھے تھے۔ شیر کی صفات، شیر کی لڑائی، شیر کا رنگ اس کو اس قدر پسند تھا کہ اس کا محل اس کی بنائی ہوئی مسجد اور گنبد تمام اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔

سلطان کی زندگی کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کو انگریزوں کی غلامی سے نجات دلا کر ایک اسلامی حکومت قائم کرے۔ اس مقصد کے حاصل کرنے کے لئے اس نے اپنی ساری زندگی وقف کر دی۔ اور آخر میں اسی کے لئے شہادت کا درجہ حاصل کیا۔ اگر اس سے نمک حرامی اور غداری نہ کی جاتی تو سارے ہندوستان پر مسلمانوں کی حکومت ہوتی ؂

نپولین کی بہادری اور جوانمردی سے کس کو انکار ہو سکتا ہے۔ اس کی شخصیت کے لئے ہر انگریز کے دل میں احترام کے جذبات موجود ہیں لیکن اس کا مقابلہ ٹیپو سے کیا جائے تو ٹیپو کی شخصیت زیادہ بلند مرتبہ معلوم ہوتی ہے۔ نپولین کی قوم نے پوری طرح اس کا ساتھ دیا۔ اس کے افسر اس کے ایک ادنیٰ اشارے پر اپنی جانیں فدا کرنے کو تیار رہتے تھے۔ مگر ٹیپو کے افسر اور وزیر اس سے ایک مدت تک غداری کرتے رہے۔ اگر سلطان غداری کا شکار نہ ہو گیا ہوتا تو اس کی فتوحات کا دائرہ نپولین سے بھی زیادہ وسیع ہوتا۔ نپولین کو جب شکست ہوئی، تو اس نے اپنا وطن دشمنوں کے حوالے کر دیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سینٹ ہلینا میں قید کر دیا گیا۔ اور قیدی ہی کی حالت میں وہ مر گیا۔ ٹیپو کو جب محض غدار اور سازشی افسروں کی وجہ سے شکست ہوئی تو اس نے میدانِ جنگ میں وطنِ عزیز کی حفاظت کرتے ہوئے لڑ کر شہید ہونا پسند کیا۔ یہی ایک بات سلطان ٹیپو کو نپولین پر فوقیت دیتی ہے ؂

انور پاشا
(غازی اور مجاہد)

انور پاشا

"انور کی سب سے بڑی آرزو یہ ہے
کہ شہید ہو جائے، اور حضرت خالد
بن ولید کے ساتھ اس کا حشر ہو۔
دُنیا چند روزہ ہے۔ موت یقینی ہے
پھر مُوت سے ڈرنا کیسا؛ جب موت
آنے ہی والی ہے، تو پھر آدمی بستر
پر پڑے پڑے کیوں مرے؛ شہادت
کی موت، موت نہیں، زندگی ہے۔
لازوال زندگی۔ میری وصیت یہ
ہے کہ تمہاری جتنی بھی اولاد ہو،

سب کو میری زندگی کے حالات سُنانا
اور سب کو میدانِ جہاد میں اسلام
اور وطن کی خدمت کے لئے بھیج دینا۔"

یہ چند سطریں اُس لمبے خط کا ایک حصّہ ہیں۔ جو ترکی کے
مشہور مجاہد اور غازی انور پاشا نے اپنی بیوی کے نام لکھا تھا
اس وقت وہ اپنے مُلک سے دُور ترکستان میں اللہ کی راہ میں
جہاد کر رہے تھے۔

انور پاشا ۱۸۸۲ء میں بمقام قسطنطنیہ پیدا ہوئے۔ والد کا
نام غازی احمد پاشا تھا۔ انور پاشا کو بچپن ہی سے ایسے کھیلوں
سے دل چسپی تھی، جن سے دلیری اور جرأت دکھانے کا موقعہ ملے
ان کی شروع ہی سے یہ آرزو تھی کہ وہ سپاہی بنیں۔ چنانچہ جب
وہ بڑے ہوئے، تو ترکی کے مشہور کالج میں داخل ہو گئے۔ اور
تھوڑی مدت میں اپنی ذہانت سے غیر معمولی ترقی حاصل کر لی
یہیں اُنھوں نے عربی، فارسی، فرانسیسی، انگریزی، جرمنی اور روسی
زبانیں سیکھ لیں۔

جنگی کالج سے نکلنے کے بعد وہ فوج میں داخل ہو گئے۔ ا
ترقّی کر کے نائب کے درجہ تک پہنچ گئے۔ بہت دنوں تک کئی نا

ر تجربہ کار ترک افسروں کے ایڈی کانگ رہے۔ اور اس طرح ان کی
حبت سے بہت فائدہ اُٹھایا۔ ۱۹۱۳ئہ میں انہیں پاشا کا معزز
خطاب ملا۔ اور وہ ترکی وزیر جنگ مقرّر ہوئے۔ اس وقت اُن کی
عُمر تیس سال سے زیادہ نہ تھی ۔

اس زمانہ میں ترکی پر سلطان عبدالحمید خاں کی حکومت تھی۔
بڑا جابر اور ظالم سُلطان تھا۔ رعایا کا بڑا حِصّہ اس کی حکومت
سے بیزار تھا۔ ترک کسانوں کو بڑے بڑے ٹیکس ادا کرنے پڑتے
تھے۔ یہ غریب سال بھر کی محنت اور کفایت شعاری سے جو سرمایہ
جمع کرتے، اس کا بڑا حِصّہ ٹیکس جمع کرنے والے لے جاتے۔ یوں تو
پولیس کا محکمہ بھی تھا، اور عدل و انصاف کا بھی لیکن لوگوں کی جان
اور مال کی حفاظت کا کوئی معقول انتظام نہ تھا، اور کسی سے انصاف
بھی نہ ہوتا تھا۔ فوج کی حالت بھی ابتر تھی۔ فوجوں کو پُورا راشن
کبھی نہ ملتا تھا، اور انہیں کافی لباس بھی میسّر نہ تھا۔ غرض مُلک
کے ہر حِصّے میں بیزاری پھیلی ہوئی تھی، اور سلطان کے خلاف
سخت جذبات پیدا ہو رہے تھے ۔

مُلک کی یہ حالت دیکھ کر چند دلیر ترکوں نے ایک انجمن قائم
کی، جس کا نام انجمنِ اتحاد و ترقّی رکھا گیا۔ اس انجمن کا مقصد یہ

تھا کہ سلطان عبدالحمید خاں ملک میں دستوری حکومت کو رائج کرے تاکہ دوسرے ملکوں کی طرح ترکی بھی شخصی ظلم سے نجات حاصل کر سکے۔ لوگوں کو بھی حکومت میں حق ملے اور اُن کی آواز بھی سُنی جائے۔ اس انجمن نے بہت جلد مقبولیت حاصل کر لی۔ اور ہزاروں لوگ اس میں شامل ہو گئے۔

اس انجمن کا رُکن ہونا کوئی آسان کام نہ تھا جب کوئی شخص اس کا رُکن ہونا چاہتا تو اسے یہ قسم کھانی پڑتی کہ مَیں خدا اور حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلّم کی قسم کھاتا ہوں کہ جب تک میرے جسم میں خُون کا ایک قطرہ بھی باقی رہے گا، مَیں قومیت، آزادی اور صداقت کے لئے جنگ کرتا رہوں گا۔

۱۹۰۵ء میں انور پاشا صوبۂ مقدونیہ کے انسپکٹر جنرل حلمی پاشا کے ایڈی کانگ تھے۔ آپ نے بھی مُلک و قوم کی خاطر اپنی وردی پھینکی اور اس انجمن میں شامل ہو گئے۔ آپ کی شمولیت سے انجمن میں ایک نئی رُوح اور تقویت پیدا ہو گئی۔ تین سال کے بعد ہی سلطان عبدالحمید کے خلاف بغاوت کا جھنڈا بلند کر دیا گیا، اور تیزی کے ساتھ انقلاب کے شعلے پھیلنے لگے۔ سلطان نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح اس تحریک کو دبا دیا جائے۔ مگر اسے ناکامی

ئی ۔ انور پاشا نے اس وقت بڑی ہر دلعزیزی حاصل کرلی تھی اور لوگ
ن پر اپنی جانیں نثار کرنے کو تیار تھے ۔ اُن کا ملک بھر میں بے حد
ثر و رسوخ تھا۔ سلطان نے کوشش کی کہ انور کو لالچ اور خوشامد سے
اضی کیا جائے ۔ چنانچہ انہیں قصر یلدیز (جہاں سلطان رہتا تھا) آنے
کی دعوت دی گئی ۔ ان سے وعدہ کیا گیا کہ انہیں جنرل بنا دیا جائے گا ۔
نور پاشا سلطان عبد الحمید کی چالوں سے خوب واقف تھے ۔ وہ جانتے
تھے کہ قسطنطنیہ جانے کے معنی یہ ہیں کہ اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھیں
بہت سے محبان وطن ترقی اور انعام کے وعدوں پر اس سے پہلے بھی
قصر یلدیز میں بلائے گئے تھے ۔ مگر پھر دنیا کو معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کہاں
اور کیونکر غائب ہو گئے ۔

انجمن اتحاد و ترقی اب کھل کر میدان میں آ گئی تھی ۔ فوج کے ایک
بڑے حصے نے حکومت کے خلاف بغاوت کر دی تھی ۔ آخر سلطان کو
بھی جھکنا پڑا ۔ اور اس نے دستوری حکومت کا اعلان کر دیا ۔ اس
اعلان سے ملک بھر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی ۔ یہ انور پاشا کی بہت
بڑی کامیابی تھی ۔

۱۹۱۰ء میں اٹلی نے بغیر کسی وجہ کے طرابلس پر حملہ کر دیا ۔
طرابلس ترکوں کے ماتحت تھا ۔ اٹلی نے طرابلس کے کئی شہروں پر

گولہ باری شروع کردی۔ اور ترکوں کی بحری فوج کو کئی مقامات پر شکست دی۔ اس شکست کا سبب یہ تھا کہ سلطان عبدالحمید نے اپنے عہدِ حکومت میں بحری فوج کی طرف کوئی توجہ نہ کی تھی۔ اگر اس نے کچھ بھی توجہ کی ہوتی، تو اٹلی کا طرابلس پر قبضہ کرنا ناممکن تھا۔

طرابلس میں ترکی فوج کی تعداد بیس ہزار سے زیادہ نہیں تھی، اور چونکہ سمندر پر اٹلی کے جہازوں کا قبضہ تھا۔ اس لئے جنگ شروع ہو جانے کے بعد بحری راستے سے فوجی مدد بھی نہیں پہنچائی جا سکتی تھی۔ خشکی کا راستہ مصر میں سے تھا۔ چونکہ مصر پر انگریزوں کا قبضہ تھا اور اس نے غیر جانبداری کا اعلان کر دیا تھا۔ اِس لئے اِس راہ سے بھی ترکی فوجیں طرابلس نہ جا سکتی تھیں۔ اس معاملہ پر غور کرنے کے لئے انجمن اتحاد و ترقی کا ایک جلسہ ہوا۔ اور اس میں یہ طے پایا کہ بہت سے ترکی افسر طرابلس بھیجے جائیں، جو وہاں کے عربوں کو جنگی قواعد سکھائیں۔ مگر مشکل یہ تھی، کہ ترک اپنی وردیوں اور لباس میں رہ کر وہاں نہیں جا سکتے تھے۔ لہٰذا قرار پایا کہ وہ بھیس بدل کر جس طرح بھی ہو سکے طرابلس پہنچ جائیں۔

انور پاشا وہاں جانے کے لئے بے تاب تھے۔ مگر وہاں پہنچنا کچھ ناممکن سا تھا۔ لیکن ناممکن کا لفظ ان کی لغت میں نہ تھا۔ وہ بھیس

بدل کر اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر انگریز افسروں کی آنکھوں میں خاک جھونکتے ہوئے مصر کے راستے سے طرابلس پہنچ گئے۔ اُنہوں نے طرابلس میں قدم رکھتے ہی سب قبیلوں میں دعوتِ جہاد شروع کر دی۔ چند ہی دنوں کے بعد ہر طرف سے مجاہد نیزے بلند کئے ہوئے اُن کے پاس آنے لگے۔ انور پاشا تنِ تنہا دشمن کے لشکر کے سامنے دلیرانہ آکر کھڑے ہو گئے۔ اور پھر نو مہینوں کے اندر ایک بار بھی اُنہوں نے شکست نہ کھائی۔ تمام عرب انور کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے۔ ان میں آپس میں ایک مدّت سے اختلافات اور دشمنیاں چلی آتی تھیں۔ مگر انور پاشا نے اُنہیں مؤثر اور دل نشین طریقے سے سمجھایا، کہ یہ کتنی بُری بات ہے۔ پھر ان میں باہم رشتہ داریاں قائم کروا دیں اور اس طرح صدیوں کی دشمنیاں بھائی چارے میں تبدیل ہو گئیں۔

اس کے بعد انور پاشا نے اُنہیں فوجی قواعد اور نظام کے ماتحت لانا شروع کیا۔ تمام قبیلوں کو چند پلٹنوں میں تبدیل کر دیا۔ اور ہر پلٹن کی تعلیم و تربیت کے لئے ایک افسر مقرر کر کے دن رات قواعد کرانا شروع کر دی۔ خود عربوں نے جب معلوم کر لیا کہ بغیر اِس قواعد کے سیکھے وہ دشمن کے حملہ کا جواب نہ دے سکیں گے اور ان سے بدلہ نہ لے سکیں گے، تو اُن میں ایک ایسا جوش پیدا ہو گیا کہ مہینوں کی قواعد

چوبیس گھنٹے کے اندر حاصل کرنے لگے۔ اس دوران میں اٹلی کی فوجوں نے
جرأت کرکے ایک دو قدم آگے بڑھائے اور عربوں پر بم برسانے لگے
یہ دیکھ کر ایک دن عربوں کے قبیلہ نے ہلہ بول دیا، اور اٹلی کے سینکڑوں
سپاہیوں کو تلوار کے گھاٹ اُتار دیا۔ اسی طرح کچھ دنوں کے بعد
چند عربوں نے اٹلی کے ایک کیمپ پر حملہ کر دیا۔ اور دیکھتے دیکھتے
پوری پلٹن کو تباہ کر دیا۔ ان کو اس حملہ میں بہت مالِ غنیمت
حاصل ہوا۔ اس میں اور چیزوں کے علاوہ آٹھ سو بندوقیں بھی تھیں۔
انور پاشا بہت خوش ہوئے۔ اب اٹلی کی فوجوں پر حملہ کرنا بچوں کا کھیل
بن کر رہ گیا۔ چند سو عرب اُٹھتے اور کھیلتے کودتے اٹلی کی پوری پلٹن کو
تباہ کر دیتے۔ اٹلی کا بے حد نقصان ہوا اور وہ بڑے بدحواس ہو گئے
اُنہوں نے بہادری اور دلیری کا جواب وحشت اور درندگی سے دینا شروع
کر دیا۔ اُنہیں اُمید تھی کہ اب ترک آسانی سے صلح کے لئے راضی
ہو جائیں گے لیکن ترکوں نے صلح کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ وہ
اُس وقت تک جنگ کو جاری رکھنے کا فیصلہ کر چکے تھے جب تک دشمن
کو شکست دے کر بھگا نہ دیں۔ مگر بدقسمتی سے بلقان کی بہت سی حکومتوں
نے ترکی پر حملہ کر دیا۔ اور انہیں مجبوراً اٹلی سے صلح کرنی پڑی۔ طرابلس
میں انور پاشا نے جو عظیم الشان کارنامے سرانجام دیئے، اُس وقت کی ساری

بنیا حیران تھی ۔

جب انور پاشا طرابلس سے قسطنطنیہ پہنچے، تو جنگ بلقان شروع
ہو چکی تھی۔ اس وقت جنگ کی یہ حالت تھی کہ ترکی کے پرانے دشمنوں
بلغاریہ اور یونان نے ادرنہ کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ ان کی فوجیں شتلجہ کے
سامنے پڑی تھیں جو قسطنطنیہ سے صرف پچیس میل کے فاصلہ پر واقع
ہے۔ دوسری طرف سرویوں اور یونانیوں نے بعض اہم مقامات پر قبضہ
کر لیا تھا۔ لیکن اس وقت جنگ عارضی طور پر ملتوی تھی۔ اور ترکی اور
دوسری قوموں کے نمائندے لندن میں صلح کی بات چیت کر رہے تھے۔
ترکی کی حکومت جس کا وزیر اعظم اس وقت کامل پاشا تھا، اس بات پر
تیار تھی، کہ ادرنہ سے دست بردار ہو جائے۔ ادرنہ سے دست برداری
کا مطلب قسطنطنیہ سے دست برداری تھی۔ مگر عین وقت پر ایک غیبی
ہاتھ نمودار ہوا جس نے ترکی کی عزت رکھ لی، اور اس وزارت کا بھی
خاتمہ کر دیا، جو ادرنہ سے دست بردار ہونے کے لئے تیار تھی۔ اس کے
بعد جو وزارت قائم ہوئی اُس نے ادرنہ سے دست برداری کا صاف
انکار کر دیا، اور اس کے ساتھ ہی صلح کانفرنس کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ یہ
غیبی ہاتھ اُسی مجاہد اور غازی انور پاشا کا تھا جس نے ترکی کو سلطان
عبدالحمید کے ظلم سے نجات دلا کر دستوری حکومت قائم کرائی تھی۔

جیسا کہ اوپر بتا آئے ہیں، انور پاشا طرابلس سے قسطنطنیہ پہنچ چکے تھے، اور ایک دن چند جاں فروشوں کو لے کر اچانک وزیر اعظم کے دفتر میں داخل ہوئے۔ ان کے ہاتھ میں ایک کاغذ تھا جس پر کئی افسروں اور لوگوں کے دستخط تھے۔ اس میں لکھا ہوا تھا کہ وزارت تبدیل کر دو یا صلح سے انکار کر دو۔ فوج کا جو حصہ وزیر اعظم کے ہاتھ میں تھا اسے پہلے ہی سے کسی بہانے سے قسطنطنیہ سے باہر بھیج دیا گیا تھا۔ جس قدر فوج شہر میں تھی، وہ سب انور پاشا کے ساتھ تھی۔ وزیر ان حالات سے بے خبر اپنے کام میں مشغول تھے کہ انور پاشا اندر داخل ہوئے۔ ناظم پاشا وزیر جنگ کے ایڈی کانگ نے اس جماعت کو روکنے کی کوشش کی۔ اور پستول چلائی۔ یکایک دوسری طرف سے بھی گولی چلی اور ناظم پاشا گر کر وہیں ٹھنڈے ہو گئے۔ گولیوں کی آوازوں سے محافظ دستے میں بھی جنبش پیدا ہوئی۔ ایک سپاہی نے انور پاشا کی طرف بندوق کی نالی بھی کر دی۔ لیکن اس بہادر نے ذرا بھی پروا نہ کی۔ اور فوراً قدم بڑھا کر اس کمرے کے اندر پہنچ گئے جہاں وزیر اعظم کامل پاشا اپنی قسمت کا فیصلہ سننے کے لئے موجود تھا۔ انور پاشا نے بڑے سخت لہجہ میں کہا: "میں حکم دیتا ہوں کہ جنگ جاری رکھنے کی قسم کھاؤ یا اس کرسی سے الگ ہو جاؤ۔ یاد رکھو تمہاری ذرا سی حیل و حجت سے یہ

کمرہ خون سے بھر جائے گا"۔

کابل پاشا مارے خوف کے کانپ رہا تھا۔ وہ بولا: "میرا خیال جنگ جاری رکھنے کے خلاف ہے"۔ اور یہ کہہ کر اپنا استعفا لکھ کر دے دیا۔

انور پاشا نے استعفا کو جیب میں ڈال کر کمرے کی چاروں طرف نظر ڈالی، اور دوسرے وزیروں سے کہا: "جب تک نئی وزارت قائم نہ ہو جائے، آپ لوگ اپنے آپ کو نظر بند سمجھیں"۔ انور پاشا نے جس تیزی دلیری اور بہادری کے ساتھ وزارت کو توڑا، وہ ہمیشہ یاد رہے گا۔

اس ضروری کام سے فارغ ہو کر انور پاشا نے فوج کی اصلاح کی طرف توجہ کی اور چند ہی روز میں اُنہوں نے اس میں ایک نئی رُوح پھُونک دی۔ لندن میں جو صُلح کانفرنس ہو رہی تھی، وہ بے اثر ثابت ہوئی۔ اور فروری ۱۹۱۳ء کو پھر جنگ شروع ہو گئی۔ اور اب کے نتیجہ ترکوں کے حق میں اچھا نکلا۔ پندرہ جولائی کو انور پاشا تھریس میں داخل ہوئے، اور پانچ دن کے بعد ادرنہ پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد اور کئی مقامات بھی دوبارہ فتح کئے۔ تھوڑے عرصے کے بعد صُلح ہو گئی۔ اور ترکی کو ایک کافی علاقہ سے دست بردار ہونا پڑا۔

فوج کی حالت اگرچہ بہت کچھ درست ہو چکی تھی لیکن ابھی اس طرف توجہ کی بڑی ضرورت تھی۔ چنانچہ انور پاشا وزیر جنگ مقرر کر دیئے

گئے۔ اُنھوں نے فوج میں اصلاحات کے احکام نافذ کیے۔ مختلف فوج
چھاؤنیوں کا معائنہ کیا اور اپنی تمام کوشش صرف اس بات پر صرف کر
لگے کہ مُلک اور قوم کو اسی عروج پر پہنچائیں، جو اسے کسی زمانے میں
حاصل تھا۔

بلقان کی جنگ کو ختم ہوئے ابھی ایک ہی سال ہُوا تھا
یورپ میں ایک نئی اور مہیب جنگ چھڑ گئی۔ ترک کسی جنگ میں حصہ
لینے کے لئے تیار نہ تھے۔ مگر حالات کچھ ایسے پیش آگئے کہ انھیں
جنگ میں مجبوراً شامل ہونا پڑا۔ اس بڑی جنگ میں ایک طرف انگ
فرانسیسی اور روسی تھے، اور دوسری طرف جرمنی اور آسٹریا۔ ترکی
جرمنی کا ساتھ دیا۔ چار سال کی خوفناک جنگ کے بعد انگریزوں اور ا
کے ساتھیوں کو فتح ہوئی اور جرمنی اور اس کے ساتھیوں کو شکس
ترکی کو سخت نقصان ہُوا۔ اور اس کے بہت سے علاقے پر دشم
قابض ہو گئے۔ ان حالات کو دیکھ کر انور پاشا اکتوبر ۱۹۱۹ء میں وز
جنگ کے عہدے سے مستعفی ہو گئے اور ترکی سے نکل گئے۔

ترکی سے نکلنے کے بعد آپ مختلف شہروں کی سیاحت کر
ہوئے سمرقند پہنچے۔ وہاں کے شہریوں نے آپ کا شاندار استقبال
ترکستان میں اس وقت ایک نئی جمہوریت قائم ہوئی تھی۔ اس

صدر نے آپ کو ایک معزز عہدے پر مقرر کر کے فوج کی تنظیم آپ کے سپرد کر دی ۔ یہاں آپ نے یہ کوشش کی کہ تمام دُنیا کے مسلمان کو ایک جھنڈے کے نیچے جمع کیا جائے ۔

روس میں اس وقت ایسے لوگوں کی حکومت تھی جنہیں بالشویک کہا جاتا ہے ۔ اسے انور پاشا اور ان کی تحریک سے بہت خوف تھا ۔ چنانچہ بالشویک حکومت نے ان کے خلاف ایک فوج بھیج دی ۔ یہ فوج اچانک ان کے سر پر آ پہنچی ۔ اگرچہ ان کے ساتھ بہت تھوڑی فوج تھی ۔ مگر آپ نے دشمن پر حملہ کر دیا ۔ اور نہایت دلیری اور بہادری سے لڑے ۔ لیکن خدائی حکم آ پہنچا تھا لڑائی کا پانسہ آپ کے خلاف پڑا ، اور آپ لڑتے لڑتے شہید ہو گئے ۔

انور کی بہادری اور دلیری کو دوست دشمن سب مانتے ہیں ان کے عظیم الشان کارنامے ترکی کی تاریخ میں سنہری حرفوں سے لکھے جائیں گے ۔ اُنہوں نے اپنے مُلک اور قوم کے لئے جو کام کیا ہے وہ ہمیشہ یاد رہے گا ۔ ان کی جنگی قابلیت کو ایک دُنیا مانتی ہے ۔ وُہ بڑے تجربہ کار سپہ سالار اور جرنیل تھے ۔ بہادری اور دلیری کے ساتھ ساتھ اُن میں اور بھی بہت سی خوبیاں تھیں ۔ وہ نہایت خلیق اور بردبار تھے ۔ ان کی زبان میں بہت مٹھاس تھی ۔ کوئی شخص ان سے

مِل کر متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ اُن کی قوّتِ ارادی بہت زبردست تھی۔ دل میں جو ٹھان لیتے تھے، اسے کرگزرتے تھے۔ اِنہی خوبیوں کی وجہ سے وہ نہ صرف ترکی بلکہ ساری دُنیا کے مسلمانوں کے محبُوب تھے۔

مصطفیٰ کمال اتاترک
(نجات دہندۂ ترکی)

مصطفےٰ کمال اتاترک

"پیارے دوست! تم فکر نہ کرو۔ مَیں راضی
بہ رضائے حق ہوں۔ اگر خدا کو مجھ سے کام لینا
منظور ہے، اور مسلمانوں کی خدمت کرنا میری
قسمت میں ہے تو مَیں ہرگز نہ مروں گا۔ اور
اگر میرا وقت آگیا ہے تو مَیں خوشی سے دُنیا
کو خیرباد کہنے کے لئے تیار ہوں۔ اگر مَیں
مرجاؤں تو دُنیائے اسلام کو میرا پیغام پہنچا
دینا کہ زندگی حرکت کا نام ہے۔ مسلمانوں
کو اگر زندہ رہنا ہے، تو رسُولِ عربیؐ کے
نقشِ قدم پر چلیں۔ سادہ زندگی اختیار کریں

محنت اور مشقت کو اپنا شعار بنائیں۔ فضول
ٹیپ ٹاپ اور وقت ضائع کرنے سے پرہیز
کریں۔ فوجی نظام سے رہیں جس طرح
حضرت فاروقِ اعظمؓ نے فوجی نظام کی تاکید
کی تھی۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلّم کے
حکم کے مطابق علم حاصل کریں۔ عقل سے
کام لیں۔ اور زندگی کا کوئی لمحہ بھی بے کار
نہ جانے دیں!"

یہ وہ الفاظ ہیں جو ترکی کے نامور مجاہد مصطفےٰ کمال اتاترک نے اپنی وفات سے کچھ دیر پہلے اپنے دوست رفیق رُشدی سے کہے تھے۔ کتنے اچھے الفاظ ہیں یہ۔ اور اگر مسلمان ان پر عمل کریں، تو ترقّی کی دوڑ میں کہاں سے کہاں پہنچ سکتے ہیں۔

عثمانی ترکوں نے تُرکی پر ساڑھے چھ سَو سال کے قریب حکومت کی۔ تین سو سال تو اُنھوں نے وہ شان و شوکت دکھائی کہ ساری دُنیا اُن کو ادب اور عزّت سے دیکھتی تھی۔ اس کے بعد حکومت کی بنیادیں کھوکھلی ہونے لگیں۔ اٹھارویں صدی میں تو اس کی حالت بہت ہی خراب ہو گئی۔ اور یورپ کے لوگ تُرکی کو مردِ بیمار کہنے لگے۔ وہ اس کی

موت کے انتظار میں تھے مگر عجیب بات ہے کہ کسی کو اس پر ہاتھ اُٹھانے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ اس وقت سلطان عبدالمجید ترکی پر حکومت کرتا تھا۔ اس کی موت کے بعد ہر طرف بغاوتیں اور شورشیں شروع ہو گئیں۔ رُوس ہاتھ پاؤں پھیلانے لگا یہاں تک کہ ترکی سے جنگ چھڑ گئی۔ آخر ۱۸۷۸ء میں برلن میں ایک معاہدہ ہُوا جس کی رُو سے ترکی کے پاس یورپ کا صرف تھوڑا سا علاقہ رہ گیا۔ یہ ایسی ٹھوکر تھی جس سے تُرک چونک اُٹھے۔ ان میں نئے خیالات پیدا ہونے لگے۔ لوگ حکومت سے بیزار ہو گئے۔ اور اُنہوں نے سوچا، آخر اُنہیں بھی مُلک کے انتظام میں حصہ لینے کا کیوں موقع نہ ملے۔ چنانچہ نوجوان ترکوں نے ایک انجمن قائم کی، جس کا نام انجمن اتحاد و ترقی رکھا گیا۔ اس کا مقصد لوگوں میں سچی محبت پیدا کرنا اور حکومت میں جو خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں، اُنہیں دُور کرنا تھا۔

۱۹۱۴ء میں دُنیا کی پہلی بڑی لڑائی شروع ہو گئی۔ اس میں جرمنی، آسٹریا اور ترکی ایک طرف تھے۔ روس، برطانیہ، فرانس دوسری طرف۔ یہ جنگ چار سال تک جاری رہی۔ آخر ۱۹۱۸ء میں جرمنی اور اس کے ساتھیوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ اس طرح عرب، شام، فلسطین اور عراق جن پر ترکوں کی حکومت تھی، ان کے قبضے سے نکل گئے۔ مصر پہلے

ہی نام کو ان کے ماتحت تھا۔ اب وہ تعلق بھی ختم ہوا۔ ایشیائے کوچک اور یورپ سے بھی ان کا اقتدار اُٹھ گیا۔ ایسی حالت میں جب کہ ترکی حکومت کا خاتمہ ہو رہا تھا، ایک تُرک مجاہد قسطنطنیہ سے بھاگ کر اناطولیہ پہنچا اور چند ساتھیوں کو اکٹھا کر کے اپنے مُلک اور قوم کی عزت بچانے کی تدبیریں سوچنے لگا۔ یہ اس کی بہادری اور جرأت کا نتیجہ ہے کہ آج ترکی کا شمار یورپ کی بڑی سلطنتوں میں ہوتا ہے۔ یہ مجاہد مصطفےٰ کمال اتاترک تھا، جسے ترک اپنا باپ کہہ کر پکارتے ہیں۔ اور اس کی ذات پر فخر کرتے ہیں۔

مصطفےٰ کمال کے باپ کا نام علی رضا آفندی تھا۔ وہ ایک غریب آدمی تھا۔ مصطفےٰ کمال ۱۸۸۱ء میں سالونیکا میں پیدا ہوا۔ علی رضا چاہتا تھا کہ اس کا بیٹا مولوی بنے۔ مگر اس آرزو کے پورا ہونے سے پہلے ہی اس کا انتقال ہو گیا۔ مصطفےٰ کمال کی والدہ اپنے بیٹے کے ساتھ سالونیکا کے قریب ایک گاؤں میں جہاں اُن کا ایک عزیز رہتا تھا، چلی گئیں اور وہیں مستقل رہائش اختیار کر لی۔ یہاں کمال کے ذمّے یہ کام کیا گیا کہ بھیڑ بکریوں کی رکھوالی کرے اور کھیتوں سے کوّے اُڑائے۔ اس نے یہ کام بڑی محنت اور چُستی سے سر انجام دیا۔ کیا مجال کہ کوئی بھیڑ بکری اِدھر سے اُدھر ہو جائے، یا کوئی کوّا کھیت کے پاس پھٹک جائے۔ ایک

روز اس کی والدہ کو خیال آیا کہ اس طرح بچے کی زندگی تباہ ہو جائے گی چنانچہ اس کی خالہ کی کوشش سے مصطفےٰ کمال کو ایک فوجی مدرسہ میں داخل کر دیا گیا۔ یہاں اس کی بہادری اور قابلیت کے جوہر کھلے۔ یہیں اس کے دل میں نئے نئے خیالات پیدا ہوئے۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ ترکی کو یورپ کی قوموں کے ظلم سے چھڑانا چاہیئے اور اس کے لئے ضروری ہے کہ سلطان عبدالحمید کو تخت سے اُتار دیا جائے۔ اس نے کالج میں انجمن وطن کے نام سے ایک انجمن قائم کی اور انجمن کی طرف سے ایک اخبار بھی نکالا جس میں اس نے بڑے زور دار مضمون لکھے، جب حکومت کو اس کی خبر ہوئی، تو بہت سے نوجوانوں کو جن میں مصطفےٰ کمال بھی تھا، گرفتار کر لیا گیا۔ چند ہفتوں کے بعد اسے رہا کر دیا گیا۔ اور سلطان کے حکم سے کبھی ایک جگہ اور کبھی دوسری جگہ بھیجا جاتا رہا۔ اور آخر سالونیکا میں تبادلہ ہو گیا۔ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد سلطان کو معزول کر دیا گیا، اور انجمن اتحاد و ترقی نے حکومت کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں لے لی۔ مصطفےٰ کمال کو اگرچہ انجمن کی بعض باتوں سے اختلاف تھا مگر جب اسے جنگی وزارت میں ایک عہدہ پیش کیا گیا تو اُس نے قبول کر لیا ؛

مصطفےٰ کمال یہ چاہتا تھا کہ اس عہدہ سے فائدہ اُٹھا کر کوئی بڑا کام کرے۔ لیکن اتنے میں جنگ بلقان شروع ہو گئی، اور ترکی پر مصیبتوں

اور پریشانیوں کا ایک پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ بلغاری فوجوں نے ترکی کے مشہور شہر اڈریانوپل کا محاصرہ کر لیا اور قلعوں کو فتح پر فتح کرتی ہوئی دارالخلافت کے قریب پہنچ گئیں۔ یونانی فوجوں نے مقدونیہ کے کئی علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ ترکی کے پاس یورپ کا صرف تھوڑا سا حصّہ باقی رہ گیا مگر انور پاشا اور کمال پاشا کی جنگی تدبیروں نے اس شکست کو فتح میں تبدیل کر دیا۔ یہ جنگ ختم ہوئی، تو ۱۹۱۴ء میں پہلی بڑی جنگ شروع ہوگئی۔ اس لڑائی میں جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں، جرمنی آسٹریا اور ترکی ایک طرف تھے، اور برطانیہ، روس اور فرانس دوسری طرف۔ انہیں اتحادی کہا جاتا تھا۔ پہلے پہل جرمنی نے اتحادیوں کو بُری طرح شکستیں دیں۔ اتحادی سخت پریشان ہوئے اور اپنی بحری برتری کو قائم رکھنے کے لئے درہ دانیال پر حملہ کر دیا۔ ابتدا میں اتحادیوں کو فتح کامل ہوئی۔ اور ترکوں کو سخت نقصان اُٹھانا پڑا۔ مگر جلد ہی ترکوں کے جوابی حملوں سے اتحادی فوجوں کے چھکے چھوٹ گئے، اور اُنہیں کئی شکستیں ہوئیں۔ اِن شکستوں کے بعد اور اِتنا نقصان اُٹھا کر اتحادیوں کو معلوم ہو گیا کہ جب تک جزیرہ نمائے گیلی پولی کے مغربی اور جنوبی ساحلوں پر فوجیں نہ اُتاری جائینگی درہ دانیال کا فتح کرنا ناممکن ہے۔ چنانچہ اُنہوں نے بہت بڑی تعداد میں اور بہترین فوجیں گیلی پولی کے ساحل پر اُتار دیں۔ اور تین چار حملوں

کے بعد ایک بڑی اچھی جگہ قبضہ کر کے چناق کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ چناق درہ دانیال کی کنجی تھی، اور درۂ دانیال پر قبضہ کرنا گویا قسطنطنیہ پر قابض ہو جانا تھا۔ اس نازک موقعہ پر اس محاذ کی کمان مصطفےٰ کمال کے سپرد ہوئی۔ اس نے ترکی فوجوں میں ایک نئی رُوح پھُونک دی۔ اور ترک سپاہیوں نے بھی ایسی جاں بازی دکھائی کہ اس کی مثال خود ان کی تاریخ میں بھی کم ملتی ہے۔ لڑائی کا سلسلہ کئی روز تک جاری رہا۔ آخر مصطفےٰ کمال نے اتحادیوں کو زبردست شکست دی۔ ایسی شکست انہیں اب تک پیش نہ آئی تھی۔ اس کامیابی نے مصطفےٰ کمال کی فوجی قابلیت کا سکہ تمام دُنیا پر بٹھا دیا۔

اِس جنگ کے دَوران میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا جس سے کمال اتاترک کی بہادری اور جرأت پر بڑی روشنی پڑتی ہے۔ ایک روز وہ خندق کے پاس کھڑا تھا کہ دشمن کی ایک توپ کے گولے اُس کے پاس آ آ کے پڑنے لگے۔ مگر اس نے ذرا بھی پروانہ کی۔ اُس کے ماتحت افسروں نے کہا کہ یہاں کھڑا ہونا ٹھیک نہیں۔ آپ کی زندگی خطرے میں ہے۔ آپ کو یہاں سے ہٹ جانا چاہیئے۔ یہ سُن کر کمال نے جواب دیا۔ اگر میں اب یہاں سے ہٹ جاؤں تو میری فوج کے سپاہی اپنے دل میں کیا کہیں گے۔ افسر کو اپنے ماتحتوں کے

لئے مثال قائم کرنی چاہیئے +

اس کے بعد مصطفےٰ کمال کو روسی محاذ پر بھیجا گیا۔ قدرت بہادر کا ساتھ دیتی ہے۔ انہی دنوں روس میں زار کی حکومت کا تختہ اُلٹ گیا۔ اس موقعہ سے فائدہ اُٹھا کر اُس نے کئی علاقے رُوسیوں سے واپس لے لئے۔ ابھی وہاں سے پُوری طرح فراغت نہ ہوئی تھی کہ مصطفےٰ کمال کو شام کے محاذ پر روانہ کر دیا گیا۔ یہاں پہنچ کر اسے فوجی وزارت کے ساتھ اختلافات پیدا ہو گئے اور اسے طویل رخصت مل گئی۔ ۱۹۱۸ء میں جرمنی اور روس کے ساتھیوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ اور عارضی صلح کی شرطوں کے مطابق ترکی فوجیں غیر مسلح کر دی گئیں۔ ترکی کی ساری سلطنت ٹکرٹے ٹکرٹے ہو گئی۔ اور ترکوں کے پاس یورپ اور ایشیا کا تھوڑا سا علاقہ باقی رہ گیا۔ اتحادیوں نے یہ فرض کر لیا، کہ ترکی اب کوئی دن کا مہمان ہے۔ اور اُنہوں نے اس سلطنت کو آپس میں بانٹنا شروع کر دیا۔ انگریزوں نے قسطنطنیہ پر عارضی طور سے قبضہ کر لیا۔ کچھ علاقے اٹلی اور فرانس نے ہتھیا لئے۔ یونانیوں کو اُن کی خدمات کا صلہ دینا بھی ضروری تھا۔ چنانچہ اُن کو سمرنا پر قبضہ کرنے کی اجازت دے دی گئی یونانی فوج برطانوی، فرانسیسی، امریکی جنگی جہازوں کے ساتھ سمرنا پہنچی اور ساحل پر اُترنے کے بعد فوراً ہی قتلِ عام اور غارت گری شروع کر

دی۔ سمرنا کے بعد یونانی آگے بڑھے، اور مکانوں کو آگ لگاتے، لوٹ مار کرتے اور عورتوں کی بے عزتی کرتے ہوئے دُور دُور تک پھیل گئے"

اس وقت مصطفےٰ کمال اناطولیہ پہنچ گیا، اور اسے دیکھ کر خوشی ہوئی کہ ترکی قوم سو نہیں رہی۔ اس میں وطنیت کا جذبہ ابھی فنا نہیں ہُوا۔ لوگ سرفروشی کے لئے تیار ہیں۔ اور جگہ جگہ وطن کی آزادی کی خاطر انجمنیں بن رہی ہیں۔ مصطفےٰ کمال نے اِن حالات سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے فوجی تنظیم شروع کر دی۔ لوگوں کو ایک مرکز پر جمع کیا۔ ان کو اتفاق و اتحاد کے رشتے میں جوڑا۔ ٹوٹی پھوٹی توپوں اور ناقص ہتھیاروں کی مرمت کی۔ قوم نے بھی جنگِ آزادی کے لئے مصطفےٰ کمال کو اپنا لیڈر چن لیا۔ اور اس جنگِ آزادی کا مرکز انگورہ (انقرہ) بنا۔

اتنے میں اناطولیہ کی ترکی فوج جو جنرل کاظم قرہ بکر پاشا کے ماتحت تھی کمال اتاترک سے آملی، جس سے اسے بڑی تقویت پہنچی۔ اس کے علاوہ ترکوں کے بڑے بڑے جرنیل بھی مختلف گوشوں سے بھاگ کر اناطولیہ پہنچ گئے۔ ان میں رؤف بے، عصمت پاشا، اور فوزی پاشا بڑے مشہور تھے۔

یونانی فوجیں سمرنا پر قبضہ کرنے کے بعد اندرونی علاقے کی طرف بڑھ رہی تھیں۔ ان کی تعداد تین لاکھ سے کم نہ تھی۔ اور یہ تنے

ہتھیاروں اور فوجی سامان سے پوری طرح مسلح تھیں۔ یونانی اپنی ابتدائی کامیابی کے نشے میں بڑھتے بڑھتے انگورہ سے چالیس پچاس میل دُور رہ گئے۔ اُن کے تین لاکھ سپاہی ستّر میل محاذِ جنگ پر پھیل گئے۔ مصطفےٰ کمال ذرہ بھی ہراساں نہ ہوا۔ اس نے بھی خفیہ طور سے پوری طرح تیاری کر رکھی تھی۔ انگورہ کے قریب ہی بڑی زبردست جنگ ہوئی۔ اس کو جنگِ سقاریہ کہتے ہیں۔ سقاریہ ایک دریا ہے جو سمرنا کے پہاڑی علاقے میں شور مچاتا بہتا چلا جاتا ہے۔ کوئی اکیس روز لڑائی ہوتی رہی، اور آخر بائیسویں روز اس کا فیصلہ ہو گیا۔

یہ جنگ دُنیا کی دس بڑی جنگوں میں سے ایک سمجھی جاتی ہے۔ مصطفےٰ کمال کی غیر معمولی جنگی قابلیت اور ترک سپاہیوں کی بہادری سے یونانیوں کو سخت شکست ہوئی۔ ایسی شکست کہ پھر ان کے پاؤں کہیں نہ جم سکے، اور انہیں ہمیشہ کے لئے سمرنا سے نکلنا پڑا۔

اس عظیم الشّان فتح سے ترکوں کے حوصلے بڑھ گئے مگر دشمنوں اور خاص کر انگریزوں کو سخت پریشانی ہوئی۔ اُنہوں نے چاہا کہ کسی طرح مصطفےٰ کمال کو ان کی کوششوں میں ناکام رکھیں۔ چنانچہ ان کے کہنے سے سلطان نے مصطفےٰ کمال کو دارالخلافہ میں طلب کیا۔ مگر اُس نے صاف انکار کر دیا۔ لیکن پھر بھی اس پر بہت زور ڈالا گیا۔ لالچ

دیا گیا۔ ڈرایا دھمکایا گیا۔ مگر وہ اپنی بات پر قائم رہا۔ اسے خوب معلوم تھا کہ اگر وہ سلطان کے پاس گیا، تو کبھی اناطولیہ واپس نہ آسکے گا۔ اس حکومت کو جو اتحادیوں کے رحم و کرم پر تھی، اور ترکوں کی جنگِ آزادی کے خلاف تھی، ختم کرنے کے لئے سیواس میں مجلس منعقد کی گئی جس میں مصطفےٰ کمال اور اس کے ساتھی شریک ہوئے۔ یہاں فیصلہ ہوا کہ ترکی میں بادشاہت کی بجائے جمہوری نظام قائم کیا جائے چنانچہ جمہوریۂ ترکیہ کا اعلان ہوا، اور مصطفےٰ کمال کو اس کا پہلا صدر مقرر کیا گیا۔

اس اعلان کو سنتے ہی سلطان کی طرف سے پھر مخالفت کی گئی مصطفےٰ کمال کو باغی قرار دیا گیا۔ مگر آزادی کی تحریک برابر جاری رہی۔ مصطفےٰ کمال کی طاقت کو دیکھ کر اٹلی اور فرانس خود بخود ترکی کے علاقوں سے رخصت ہو گئے۔ اور آخر میں اتحادیوں نے بھی قسطنطنیہ خالی کر دیا۔ اور اس طرح سارا ملک مصطفےٰ کمال کے قبضے میں آگیا۔

اس کام کی تکمیل کے بعد مصطفےٰ کمال نے ملکی انتظام کی طرف توجہ کی۔ اور اپنی انتھک کوششوں سے ترکی کو دنیا کی ترقی یافتہ قوموں کے برابر کھڑا کر دیا۔ اس کی فتوحات بھی حیرت انگیز تھیں۔ اور اس کا یہ کارنامہ بھی حیرت انگیز ہے۔

اُس نے پندرہ سال کی مدّت میں اپنے مُلک کو کیا سے کیا بنا دیا۔ جگہ جگہ سکوُل کھُل گئے۔ کالج قائم ہو گئے، جن میں لڑکیاں اور لڑکے دونوں پڑھنے لگے۔ پُرانی سڑکوں اور پُلوں کی مرمّت کرائی گئی۔ اور نئی سڑکوں کا مُلک کے ایک سرے سے لے کر دُوسرے سرے تک جال بچھ گیا۔ تجارت اور صنعت وحرفت کو ترقی دینے کے لئے سینکڑوں کارخانے بنائے جن میں ضرورت کی چیزیں تیار ہونے لگیں اور ترُک بیرونی مُلکوں کے محتاج نہ رہے۔ اُس نے انقرہ جیسے چھوٹے سے قصبہ کو وہ ترقی دی کہ آج اس کا شمار دُنیا کے بڑے بڑے شہروں میں ہوتا ہے۔ یونان، بلغاریہ اور بلقان کی دوسری ریاستوں میں کئی ترک خاندان آباد تھے جن کے افراد کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی تھی۔ مصطفےٰ کمال نے ان سب کو ترُکی واپس بُلا لیا۔ ان کا بسانا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ مگر اُس نے ایسا انتظام کیا کہ اُنہیں ذرہ بھی تکلیف نہ ہوئی۔ آپ خود سمجھ سکتے ہیں، کہ ان لوگوں کے دلوں سے کمال کے لئے کتنی دُعائیں نکلتی ہوں گی؟

ترکی کے دشمن یہ کہتے ہیں کہ مصطفےٰ کمال کو اسلام سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ مگر یہ بات بالکل غلط ہے۔ جو لوگ بھی اس نامور مجاہد سے ملے ہیں، اُنہوں نے بتایا ہے، کہ اسے رسُول اللہ سے خاص

محبّت اور عقیدت تھی ۔ وہ کہا کرتا تھا کہ دُنیا نے ایسا عظیم الشّان
انسان ابھی تک پیدا نہیں کیا اور نہ کر سکے گی ۔

مُلکی کاموں کی کثرت نے مصطفےٰ کمال کی صحت پر بڑا اثر کیا تھا
۱۹۳۸ء میں اِس پر فالج کا حملہ ہوا۔ اور ڈاکٹروں کی کوشش کے
باوجود کچھ عرصہ کے بعد اس مجاہد کا انتقال ہو گیا ۔ میّت کو شاہی
لباس پہنا کر تین دن تک کھُلے تابوت میں رکھا گیا تاکہ لوگ آخری
بار چہرہ دیکھ سکیں ۔ تیسرے دن تابوت اُٹھایا گیا ۔ تقریباً پانچ لاکھ
انسان جنازے کے ہمراہ تھے ۔ دُنیا کی تمام حکومتوں کے نمائندے
اور سفیر بھی شریک تھے ۔ لوگ زار و قطار روتے جا رہے تھے ۔ عورتیں
چلاّ چلاّ کر کہہ رہی تھیں " اتاترک ! آپ کہاں ہیں ؟ " میّت دفنانے
کے بعد تین منٹ تک مُلک بھر میں خاموشی منائی گئی ۔

ترک مصطفےٰ کمال کو اتاترک یعنی اپنا باپ کہہ کر پکارتے
تھے ۔ اور کیوں نہ پکارتے ۔ اُس نے اُن میں نئی رُوح اور نئی
زندگی پیدا کر دی تھی ۔ وہ کہتے ہیں اور بالکل ٹھیک کہتے ہیں کہ
اتاترک مصطفےٰ کمال مرا نہیں زندہ ہے ۔ اس کے کام زندہ ہیں ۔
اس کی پالیسی زندہ ہے ۔ اور وہ ترکی قوم کے دلوں میں ہمیشہ زندہ
رہے گا !

صحبتِ پیرِ رومؒ سے مجھ پہ ہوا یہ راز فاش
لاکھ حکیم سر بجیب، ایک کلیم سر بکف

اقبالؒ

مسلمان سپہ سالار اور فاتح

حصہ دوم

سید محمد نصیر جامعی

احسن برادرز چوک انارکلی لاہور